U76967. 15-12-09

Title - SHORA UL UJAM. (Part-2).

Creator - Shibli Nemani

Publisher - Darul Masnafeen (Azamgarh).

Date - 1325 H.

Pages - 270

Subjects - Farsi Shayari - Tanqeed-o-Tareekh.

شعر العجم

حصۂ دوم

خواجہ فرید الدین عطارؒ سے حافظ اور ابن یمین تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف
تاریخ عجم
۱۳۲۴ھ

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف
تذکرہ
۱۳۲۵ھ

مصنفہ
مولانا شبلی نعمانیؒ

در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع شد
۱۹۱۶ء

فہرست مضامین

شعرالعجم حصہ دوم

شعر العجم

حصّہ دوم

(ساتویں صدی ہجری تا سنہ ۹۰۰ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاعری بلکہ تمام اسلامی علوم و فنون کا جوش شباب تھا کہ دفعتہ تاتار کی طرف سے اس زور کا طوفان اٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا، یعنی سنہ ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک بے چراغ کر دیا، کم و بیش چالیس لاکھ آدمی کا خون بہہ گیا، سیکڑوں ہزاروں شہر خاک کے برابر ہو گئے، مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اُڑ گیا، لیکن اسلام کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں پر بھی زندہ بچ گیا، بلکہ جوں ہی یہ طوفان تھمنا شروع ہوا، دبی ہوئی چنگاریاں پھر چمکیں اور چمک کر اس طرح مشتعل ہوئیں کہ ایک دفعہ پھر عالم تمام مطلع انوار ہو گیا،

چنگیز خاں ایک غارت گر کی شان سے اٹھا تھا، اور اپنے فوری اور سرسری انتظامات کے لیے اس نے کچھ قاعدے بھی بنا لئے تھے جو تو رۂ چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں، لیکن جب سلطنت کو استقلال ہوا تو شاہانہ نظم و نسق کی ضرورت پڑی، تاتاری لوٹ مار کے سوا

اور کچھ جانتے نہ تھے، اس لیے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا، چنگیز خاں کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن اور اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں تخت نشین ہوا، ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا، رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا، یہاں تک کہ اس کا بیٹا تکودار دار، خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد رکھا، ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغوں خاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کر کے ۶۸۳ھ میں قتل کر دیا، لیکن جب ارغوں خاں کا بیٹا غازان خاں ۶۹۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا، اور اس کے ساتھ ساٹھ ہزار ترک مسلمان ہو گئے، غازان ۷۰۳ھ میں مر گیا، اس کے بعد اس کا بھائی خدابندہ اور اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابوسعید بادشاہ ہوا، یہ تمام سلاطین نہایت عادل، انصاف پسند، مدبر اور دیندار تھے، اور بالخصوص سلطان ابوسعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گذرے ہیں اپنی مثنوی جام جم میں ابوسعید کی اس طرح مداحی کی ہے،

دو جہاں را صلائے عید زوند	سکہ بر نام بوسعید زوند
در چمن گفتہ بلبل و قمری	مدح ایں گلبن اولوالامری

سلطان ابوسعید نے ۷۳۶ھ میں وفات پائی، تمام ملک نے اس کے مرنے کا ماتم کیا، یہانتک کہ مسجد کے میناروں پر ماتمی کپڑے لپیٹے گئے، اور ہر شہر کی گلی کوچوں میں کئی کئی دن تک خاک اڑتی رہی، چونکہ سلطان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے ہر طرف سے سرداروں نے خودسری کی، آذربائجان، امیر چوبان و شیخ حسن جلائر نے دبا لیا، عراق اور فارس پر مظفر نے قبضہ کیا، غرض ۷۳۶ھ سے ۷۸۱ھ تک تمام تو تیں پریشان رہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے فرماں روا آپس میں

لڑتے بھڑتے رہے، یہی زمانہ ہے جو تاریخ میں طوائف الملوکی کے نام سے مشہور ہے[1]،

بالآخر تیمور اٹھا اور تمام دعویداروں کو مٹا کر شہنشاہی قائم کی، اس کے خاندان میں حکومت کا جو سلسلہ قائم ہوا، اس کا خاتمہ سلاطین صفویہ کے آغاز سے جا کر ملتا ہے جہاں سے ہماری کتاب کا تیسرا حصہ شروع ہوتا ہے،

مذکورۂ بالا واقعات میں ہمارے کام کی جو باتیں ہیں حسب ذیل ہیں ؛

۱- تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں اس نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کر دیا، اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں، شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لیے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً

ہمای ہمایوں خواجوی کرمانی، آئینہ اسکندری امیر خسرو، سکندر نامۂ جامی، تیمور نامۂ ہاتفی شاہنامۂ قاسم گونابادی، اکبر نامہ فیضی، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے ہیں، دل میں کچھ نہیں، قوم اس قدر افسردہ ہو گئی تھی کہ ان کتابوں کے دو شعر بھی زبانوں پر نہ رہ سکے،

۲- عام قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا ہے، اس لیے اس عہد میں تصوف کا زیادہ زور ہوا، عطار، مولینا روم، اوحدی، عراقی، سعدی، مغربی، انہی اسباب کے نتائج ہیں،

۳- جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا جو تصوف کے سوا، ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا، یعنی غزل گوئی یہ مسلّم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اس کی ابتدا شیخ سعدی اور اُن کے معاصرین سے ہوئی، یہ اسی کا اثر ہے،

---

[1] یہ تمام حالات اول سے آخر تک مجالس المومنین اور دولت شاہی سے لیے گئے ہیں۔

تاتار اور تیموریہ کی عام سفاکی نے قوموں کی قومیں غارت کردیں، بڑے بڑے کج کلاہوں اور اورنگ نشینوں کا تاج و تخت خاک میں ملا دیا، خراسان سے لیکر شام تک زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا، ام الدنیا بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، تمام بڑے بڑے پایۂ تختوں میں خاک اڑنے لگی، کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہو گئے، ان امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلاب کا ایسا نقشہ کھینچ دیا تھا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا، اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے، شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے، ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی زبان پر آیا، اور پھر ایک روش قائم ہو گئی، اور سب اسی انداز میں کہنے لگے،

۴۔ ترک و مغل بادشاہ اگرچہ اکثر نہایت مدبر اور عادل تھے اور اس لیے ان کے عہد میں عام امن و امان رہا، لیکن طبیعتوں میں شاعری کا مذاق نہ تھا اسلئے دربار میں شعراء کی چنداں قدر نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے جو مشہور شعراء ہیں، مثلاً، سعدی، خواجہ حافظ، مولانا روم، اوحدی، ابن یمین کسی دربار سے خاص تعلق نہ رکھتے تھے، نہ سلطنت سے ان کو کوئی خطاب حاصل تھا،

۵۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں فی الجملہ آزادی کی روح آئی، سعدی اور ابن یمین کے قصائد اور قطعات میں جو خوشامد و بیہودہ مداحی کی جا بجا عیب گیری پائی جاتی ہے، وہ اسی کا اثر ہے۔

۶۔ تیموریہ خاندان جو ایران میں قائم ہوا اس کا خاتمہ سلطان حسین مرزا پر ہوا، وہ عادل اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا نہایت فریفتہ اور قدردان تھا، اس لئے اس کے عہد میں شاعری اس کثرت سے پھیلی کہ بچہ بچہ شاعر بن گیا والہ داغستانی ریاض الشعراء

میں لکھتے ہیں :

> درر عایت فضلاء و شعرا سعی بلیغ فرمودہ است و در تربیت شعرا آں قدر مبالغہ کردہ است کہ فن شاعری کہ فضیلت علوم رالازمہ دانشت از علم جدا شد و ہر بے مایہ بمحض طبیعت موزوں ارادہ شاعری کرد، رفتہ رفتہ فن شاعری کہ الطف فنون بود از درجۂ اعتبار افتادہ بمضحکہ انجامید،

سلطان حسین کا انجام صفویہ کے آغاز سے ملا ہوا ہے، اس لیے صفویہ کے زمانہ میں دفعتہً جو ایران کے چپہ چپہ سے شعراء ابل پڑے، یہ وہی سلطان حسین کے ابر فیض کے رشحات تھے، والہ داغستانی کو تو یہ رنج ہے کہ اس تعمیم کی وجہ سے ہر عامی شعر کہنے لگا اور علمی کمالات کی قید اٹھ گئی، لیکن ہمارے نزدیک، اسی بات نے شاعری کو شاعری کے رتبہ پر پہنچایا، بے شبہ پہلے شعرا کے لیے علوم عربیہ اور معقول و منقول سے واقف ہونا ضروری ہوتا تھا لیکن ان کمالات کے بوجھ میں اصلی جذبات دب کر رہ جاتے ہیں، وقار و متانت اور عوام کے معتقد علیہ ہونے کی وجہ سے اکثر جذبات اس آزادی سے ظاہر نہیں ہوتے تھے جس طرح دل میں آتے تھے یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین کی عشقیہ شاعری، اس قدر اصلی جذبات سے لبریز ہے کہ قدماء کے یہاں اس کا پتہ بھی نہیں لگ سکتا،

اس دور میں شاعری میں اصناف ذیل کو ترقی ہوئی،

تصوّف، عطار، مولٰنا روم، اوحدی، عراقی، مغربی،

غزل، مولٰنا روم، شیخ سعدی، امیر خسرو، حسن، خواجہ حافظ،

اخلاق و موعظت، شیخ سعدی، ابن یمین،

قصیدہ گوئی، کمال اسمٰعیل، سلمان ساؤجی،

قصیدہ گوئی میں جو ترقی ہوئی، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱۔ زبان زیادہ صاف ہوگئی، قدماء کے دور میں ظہیر فاریابی نے زبان کو جس حد تک صاف کردیا تھا، وہ اس دور کی اخیر سرحد ہے کمال اسمٰعیل نے اور بھی زیادہ صاف کیا،

۲۔ مضمون آفرینی میں بہت ترقی ہوئی، کمال نے ابتدا کی اور سلمان نے اس حد تک پہنچا دیا کہ متاخرین کی سرحد سے ڈانڈا مل گیا،

۳۔ خاقانی و انوری وغیرہ جو علمی اصطلاحات سے کلام کو زیر بار کرتے تھے، یہ بات جاتی رہی، اس عہد کے قصائد ایک عامی کو بھی دیدئے جائیں تو اصطلاحات وغیرہ کی بنا پر اس کو کہیں اٹکاؤ نہ ہوگا،

اب ہم اس دور کے مشہور شعراء کا حال لکھتے ہیں،

اس موقع پر اس قدر لکھ دینا ضرور ہے کہ اس دور کے ایک بڑے رکن شاعری یعنی مولانا روم کا تذکرہ ہم کو قلم انداز کرنا پڑا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے حالات اور ان کی شاعری پر ایک مستقل کتاب "سوانح مولانا روم" کے نام سے لکھ چکے ہیں، اور وہ گھر گھر پھیل چکی ہے،

در بکر بستن مضمونِ رنگیں لطف نیست　　　کم دہد رنگ ار کسی بند دحنائے بستہ را

خواجہ فریدالدّین عطّار

(ولادت شعبان ۵۱۳ھ، وفات ۶۲۷ھ)

(اصلی نام محمد تھا، فریدالدین لقب ہے، نیشاپور کے اضلاع میں کدگن ایک گاؤں ہے، وہاں کے رہنے والے تھے، ان کے والد ابراہیم بن اسحاق، عطاری کا پیشہ کرتے تھے، اور کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے کارخانہ کو اور زیادہ رونق دی، ریاض العارفین میں لکھا ہے کہ نیشاپور کے تمام کارخانے خواجہ صاحب کے اہتمام میں تھے، ارباب تذکرہ متفقاً لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب ایک دن دکان میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی طرف سے ایک فقیر آنکلا، اور اُن کی دکان کے ساز وسامان اور آرایش کو دیر تک غور سے دیکھا کیا، خواجہ صاحب نے ناراض ہوکر کہا کیوں بے فائدہ اوقات ضائع کرتے ہو، اپنا راستہ لو، اس نے کہا تم اپنی فکر کرو میرا جانا کیا مشکل ہے، بس یہ چلا، یہ کہکر وہیں لیٹ گیا، خواجہ صاحب نے اٹھ کر دیکھا تو تمام ہو چکا تھا، سخت متاثر ہوئے، کھڑے کھڑے دکان لٹوادی اور سارا کاروبار چھوڑ کر فقیر ہو گئے،)

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی تصنیفات نہیں پڑھیں، ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوّف اور فقر کے کوچہ میں آنے کے بعد بھی وہ اپنے قدیم پیشہ میں مشغول رہے اور اسی حالت میں اسرار اور عرفان کے حقائق پر کتابیں لکھتے رہے، مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ جو ان کی قابلِ قدر تصنیفیں ہیں، اسی زمانہ

کی تصنیف ہیں، چنانچہ خود لکھتے ہیں،

مصیبت نامہ کاندوہ جہان است ‏ الٰہی نامہ کاسرار عیان است

بہ دار و خانہ ہر دو کردم آغاز ‏ چہ گویم؟ زود رستم زیں وآں باز

خواجہ صاحب کی تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عطار نہیں بلکہ طبیب بھی تھے، اور بڑے زور شور کا مطب تھا، روزانہ پان سو آدمی ان کے مطب میں آتے تھے، خسرو نامہ میں لکھتے ہیں،

بہ دار و خانہ پانصد شخص بودند ‏ کہ در ہر روز نبضم می نمودند

میان آں ہمہ گفت و شنیدم ‏ سخن را بہ ازیں رئے ندیدم

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

بمن گفت اے بمعنی عالم افروز ‏ چنیں مشغول طب گشتی شب و روز

سال است ایں زماں تا لب بہ بستی ‏ بہ زہد خشک در کنجے نشستی

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب بچپن سے درد آشنا تھے، ان کے والد قطب الدین حیدر کے مرید تھے، جو مشہور مجذوب گذرے ہیں، اور ۵۹۷ھ تک زندہ تھے، جب کہ خواجہ صاحب کی عمر ۸۴ برس کی تھی، خواجہ صاحب نے بچپن ہی میں ان سے فیض حاصل کیا تھا[1] لیکن چونکہ اسلام رہبانیت کو گوارا نہیں کرتا اور اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کو ان کے مجاہدات اور ریاضتیں مشاغل دنیوی سے مانع نہیں آتیں، اس لیے خواجہ صاحب نے باوجود فقر اور تصوف کے عطار خانہ اور مطب کا تعلق قائم رکھا، اور متعدد کتابیں اسی حالت میں تصنیف کیں، یہ ممکن ہے کہ اخیر میں جب جذبۂ محبت زیادہ بڑھا تو خود بخود اور چیزوں سے دل

---

[1] دولت شاہ،

اچاٹ ہوگیا، اسی حالت میں فقیر کا واقعہ گذرا، اور اس نے آگ پر روغن کا کام دیا، خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم میں انھوں نے مدت تک سیاحی بھی کی، لسان الغیب میں لکھتے ہیں،

چار اقلیم جہاں گردیدہ ام | سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق
سر برآوردہ بہ محبوبے عشق | سیحن و جیحو نش را ببریدہ ام
کوفہ و رےتا خراساں گشتہ ام | رفتہ چوں اہل خطا از سوے چیں
ملک ہندوستاں و ترکستاں زمیں | اوفتادہ از من بعالم ایں صدائے
عاقبت کردم بہ نیشاپور جاے | با خدائے خویش کردم وحدتے
در نشاپورم بہ کنج خلوتے |

خواجہ صاحب نے اگرچہ بہت سے بزرگوں سے فیض اٹھایا تھا، لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے، خرقۂ فقر مجد الدین بغدادی سے حاصل کیا تھا،

مجد الدین بغدادی، قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب[۱] خاص تھے، جس زمانہ میں چنگیز خاں دنیا کے مرقع کو زیر و زبر کر رہا تھا، خواجہ صاحب نیشاپور میں تھے، نیشاپور کی غارت گری میں ایک مغل نے خواجہ صاحب کو پکڑ کر قتل کر دینا چاہا، برابر سے ایک مغل بولا کہ ہزار روپے پر میرے ہاتھ بیچ ڈالو، خواجہ صاحب نے مغل سے کہا کہ اتنی قیمت پر کبھی نہ بیچنا میرے دام بہت زیادہ ہیں، ایک اور مغل آنکلا، اس نے کہا اس غلام کو میرے ہات ایک توبڑہ گھاس کے معاوضہ میں فروخت کردو، خواجہ صاحب نے گرفتار کرنیوالے سے کہا ضرور بیچ ڈالو، میری قیمت اس سے کہیں کم ہے، خواجہ صاحب کی اس اختلاف بیانی

---

[۱] ریاض العارفین،

کو وہ مسخر سمجھا، اور ان کو قتل کر ڈالا، وہ اس نکتہ کو کیا سمجھتا تھا کہ واقعی انسان سے بڑھکر کوئی چیز گراں نہیں، اور نہ اس سے بڑھکر کوئی چیز ارزاں ہے، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین ۝

مغل نے خواجہ صاحب کو قتل کر دیا، لیکن خواجہ صاحب کا خون خالی نہیں جا سکتا تھا، مغل کو ان کی عظمت کا حال معلوم ہوا تو توبہ کر کے ان کے مزار کا مجاور ہو گیا، اور مرتے دم تک جدا نہ ہوا[1]،

خواجہ صاحب کی تصنیفات تصنیفات کی تفصیل یہ ہے، اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ، جوہر الذات، وصیت نامہ، منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، گل و ہرمز، سیاہ نامہ، شتر نامہ، مختار نامہ، ان کے علاوہ غزلوں اور رباعیوں کا دیوان ہے، کل اشعار ایک لاکھ سے زیادہ ہیں، فقراء کا ایک تذکرہ لکھا ہے جو تذکرۃ الاولیاء کے نام سے مشہور ہے، اور حال میں مسٹر براؤن نے اس کو شائع کیا ہے، عبد الوہاب قزوینی نے جو مسٹر براؤن کے شاگرد ہیں، ایک محققانہ دیباچہ لکھا ہے،

کلام پر رائے صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں، سنائی، اوحدی، مولانا روم، اور خواجہ فریدالدین عطار، خود مولانا روم باوجود ہم رنگی کے فرماتے ہیں، ؏

ما از پس سنائی و عطار آمدیم

ہفت شہر عشق را عطار گشت | ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کیے ہیں، وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں، لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا، ان پر خاتمہ ہو گیا، ہر قسم

[1] ریاض العارفین،

کے خیالات اس بے تکلفی، روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہو سکتے،

اس کے ساتھ قوتِ تخیل بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، بہت سے نئے مضامین پیدا کئے ہیں، اور جو پہلے بندھ چکے تھے، ان کو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں کہ بالکل نیا مضمون معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ مضمون کہ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد،

سقراط، فارابی، بوعلی سینا، الگ الگ طریقہ سے ادا کر چکے ہیں، تاہم خواجہ صاحب نے اس کی بالکل صورت بدل دی، فرماتے ہیں،

کاملے گفتہ است می باید بسے — عقل و حکمت تا شود گویا کسے
باز باید عقل بے حد و قیاس — تا شود خاموش یک حکمت شناس

یعنی ایک کامل کا قول ہے کہ بولنے اور تقریر کرنے کے لیے بہت عقل اور حکمت درکار ہے، لیکن چپ رہنے کے لیے اس سے بھی کہیں زیادہ عقل درکار ہے مطلب یہ ہے کہ جب انسان انتہائے درجۂ کمال تک پہنچتا ہے، تب جاکر یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں سمجھا اور اس بناء پر چپ ہو جاتا ہے، اسی خیال کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے،

می پنداری کہ جاں توانی دیدن — اسرارِ ہمہ جہاں توانی دیدن
ہر گاہ کہ بینشِ تو گردد بکمال — کوری خود آں زماں توانی دیدن

وحدت وجود کا مضمون حد سے زیادہ پامال ہو چکا تھا، تاہم خواجہ صاحب کے پیرائے نئے ہیں،

پر شد از دوست ہر دو کون ولیک — سوئے او زہرہ اشارت نیست

خاقانی نے اسی مضمون کو اڑایا ہے،

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست　　از نامی تواں کہ اشارت با و کنند

خواجہ صاحب کے اور مختلف طرز ادا دیکھو،

از برائے غریب خود گشت　　جلوہ در قد و در قدم رفتار
تاب در زلف، و وسمہ بر ابرو　　سرمہ در چشم، و غازہ بر رخسار
رنگ در آب و آب در یاقوت　　بوی در مشک، و مشک در تاتار
ہم باذنی و قسم باذن اللہ　　ہر دو اک نغمہ آمد از لب یار
تو از دریا جدائی ویں عجب بیں　　ز تو یک لحظہ ایں دریا جدا نیست
در عشق چو من توام تو من باش　　یک پیرہن ست گو دو تن باش

خواجہ صاحب کا جو فلسفہ ہے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا،

عبادت اور وحی کی حقیقت،

روزہ حفظ است از خطرات　　پس بود یا شاہدہ افطار
حج چہ باشد ز خود سفر کردن　　بکجا؟ جانب ہدایت کار
وحی چہ بود ہر آنچہ در دل تو　　سرزند از نتائج اسرار

انسان اصل حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا،

قرب سی سال بود تا کہ ہمی کندم جاں　　کہ بجہاں راہ برم راہ نہ بر دم بہ تنم
گرچہ بسیاری سخن بازی فکرت کردہ ام　　بیش ازیں چیزے نمی دانم کہ سر گردانم
وصل تو گنجے است، ہم پنہاں ز خود　　ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست
بیگانہ شدم ز ہر دو عالم　　واگہ نہ کہ آشنای من کیست
چندیں در بستہ بے کلید است چہ سود　　کس نام کشادن نشنید است چہ سود

پیراہنِ یوسف ست یک یک ذرات　　یوسف زمیانہ ناپدیداست چہ سود
نقش تو در خیال وخیال از تو بے بصر　　نام تو بر زبان و زبان از تو بے خبر
درحقیقت گر قدم خواہی زدن　　محو گردی تاکہ دم خواہی زدن
ہر آں مستے کہ بشناسد سر از پا　　از و دعویٔ مستی ناپسنداست
اگر در عشق از عشقت خبر نیست　　ترا ایں عشق عشقِ سود مند است
عشق بتان ز خویشتن بفروش　　کز انکو ترا ازیں تجارت نیست
دریں دریا کہ من ہستم نہ من ہستم نہ دریا ہم　　نداند ہیچ کس ایں سر مگر آں کو چنیں باشد
ترا در راہ یک یکدم چو معراجیست سوئے حق　　زیک یک پایہ برتر می گذر چندانکہ بتوانی
گرفتم در بہشتِ نسیہ نتوانی رسیدن تو　　ولے خود را ازیں دوزخ کہ نقد تست برہانی

اخیر شعر میں ان لوگوں کے خیال کو رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بہشت کوئی چیز نہیں اس کو ادھار سمجھنا چاہئیے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ مانا کہ بہشت ادھار ہے، لیکن یہ تو کرنا چاہئیے کہ اس نقد دوزخ (تفکرات دنیوی) سے نجات ہاتھ آئے،

تو چوں دربند صد چیزے خدارا بندہ چوں گردی　　کہ تو در بند ہر چیزے کہ ہستی بندۂ آنی

عالم حقیقت کفر و اسلام دونوں سے بالاتر ہے،

لبِ دریا ہمہ کفرست و دریا جملہ دینداری　　ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد

انسان ہی میں سب کچھ ہے،

انچہ می جوئید بیرون دو عالم سالکاں　　خویش را یابند چوں ایں پردہ از ہم بردرند
بہ ہمیں دیدہ سبنگری ظاہر　　صورتِ خویش را بصورتِ یار
ہر کہ ایں جا ندیدہ محروم ست　　در قیامت ز لذتِ دیدار

انا لیلیٰ بگو اگر مردی　　　ورنہ چوں ابلہاں سری می‌خوار

وحدت وجود

جہاں از تو پُر و تو در جہاں نہ　　　ہمہ در تو گم و تو در میاں نہ

خموشی تو از گویائی تست　　　نہانی تو از پیدائی تست

ترا با ذرّہ ذرّہ راہ بینم　　　دو عالم ثمّ وجہ اللہ بینم

دوئی را نیست رہ در حضرت تو　　　ہمہ عالم توئی و قدرت تو

نکو گوئے نکو گفتہ است درذات　　　کہ التوحید اسقاط الاضافات

خدا را جز خدا یک دوست کس نیست　　　کہ در خورد خدا ہم اوست کس نیست

درین معنی کہ من گفتم شکے نیست　　　تو بے چشمی و عالم جز یکے نیست

کمال اسمٰعیل خلّاق المعانی اصفہانی

(وفات ۶۳۵ ہجری)

اسمٰعیل نام اور کمال تخلص تھا، ان کے والد جمال الدین عبد الرزاق مشہور شاعر تھے، ان کا پورا دیوان آج موجود ہے، آتش کدہ میں ان کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، ان کے دو بیٹے تھے، عبد الکریم اور اسمٰعیل، عبد الکریم فقیہ تھے، اسمٰعیل نے بھی درسی علوم حاصل کیے تھے، لیکن شاعری کا مذاق خاندانی تھا، اس لیے اسی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا، خاندانِ صاعدیہ[1] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جلال الدین خوارزم شاہ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا ہے، جو دیوان میں موجود ہے، لیکن درباروں میں چنداں قدر نہیں ہوئی،

ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ خاندانِ صاعدیہ کی مدح کرتے ہیں اور سلاطین سے اعراض کرتے ہیں، بولے کہ صاعدیہ سخن فہم ہیں، اُن سے داد سخن ملتی ہے، اور میں اسکو صلہ سے بڑھ کر سمجھتا ہوں ہم چار و ناچار سلاطین کی مدح بھی کرتے تھے

بہارستان سخن[2] میں لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوقی گرجستان کو فتح کرکے اصفہان میں آیا تو کمال نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ ہے،

---

[1] یہ کوئی شاہی خاندان نہ تھا بلکہ اصفہان کے قضاۃ میں تھے،

[2] بہارستان سخن از شاہ نواز خاں مصنف مآثر الامراء

حجاب ظلم تو برداشتی ز چہرۂ عدل	نقاب کفر تو بکشادی از رخ ایماں

بالآخر افسردہ ہو کر ترک تعلقات کیا، اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی، دیوان میں ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں موجود ہے، ایک دفعہ کسی بات پر اہل وطن سے ناراض ہوئے، اور نظم میں بددعا کی،

اے خداوند ہفت سیارہ	بادشاہے فرست خوں خوارہ
تا در کوہ را چو دشت کند	جوئے خوں آورد ز جو بارہ[1]
عدد مرداں بیفزاید	ہر یکے را کند بہ صد پارہ

۶۳۵ھ میں جب اوکتائی قاآن، اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا، اس زمانہ میں یہ گوشہ نشین ہو چکے تھے، اور شہر کے باہر ایک زاویہ میں رہتے تھے، چونکہ لوگ اُن کا ادب کرتے تھے، اور ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا، اس لیے اکثر لوگ نقدی وغیرہ ان کے گھر میں لاکر امانت کے طور پر رکھ دیتے تھے، گھر میں ایک کنواں تھا، وہ ان امانتوں کا خزانہ بن گیا تھا، شہر کی غارت گری میں ایک ترک اس طرف نکل آیا، اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا، اتفاق سے زہ گیر اڑ کر کنویں میں جا پڑی، ترک کنویں میں اترا، زر و جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، سمجھا کہ اور بھی خزانے گڑے ہوں گے، کمال اسمٰعیل کو پکڑا کہ پتہ بتاؤ، انھوں نے لاعلمی ظاہر کی، اس نے غصہ میں آکر اُن کا خاتمہ کر دیا، مرتے وقت یہ رباعی کہی اور اپنے خون سے دیوار پر لکھی،

دل خوں شد و شرط جانگدازی این است	در حضرت تو کمینہ بازی این است
با این ہمہ ہیچ دم نمے باید زد[2]	شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

---

[1] اصفہان کے ایک محلہ کا نام ہے۔ [2] یہ تمام حالات آتشکدہ اور دولت شاہ سے ماخوذ ہیں،

ریاض الشعرا میں ایک اور رباعی لکھی ہے جو کمال نے اس حالت میں لکھی تھی، وہ یہ ہے

این کشتۂ تیغ، کمال اسمٰعیل است　　قربان شدنش نہ از رہ تعجیل است
قربان تو شد کمال اندر رہ عشق　　قربان شدن از کمال اسمٰعیل است

ید بیضا میں لکھا ہے کہ ترک کی انگوٹھی گر گئی تھی، اس کے نکالنے کے لیے وہ کنوئیں میں اترا تھا، ید بیضا میں اس واقعہ سنہ ۶۲۶ لکھا ہے،

شاعری | کمال کی شاعری قدما اور متاخرین کی مشترک سرحد ہے، یعنی اس کا ایک سرا قدما اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے، قدما کی متانت، پختگی، استواری اور متاخرین کی مضمون بندی، خیال آفرینی، نزاکت مضمون، دونوں یکجا جمع ہو گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین دونوں ان کے معترف ہیں، خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں،

گر بادرت نمی شود از بندہ این حدیث　　از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم
گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر　　آن مہر بر کہ افگنم و دل کجا برم

عرفی کہتا ہے،

مراز نسبت ہمدردی کمال غم است　　وگرنہ شعر چہ غم دارد از غلط خوانی

حزیں کے زمانہ میں بحث پیدا ہوئی کہ کمال اور جمال میں سے کس کو ترجیح ہے؟ لوگوں نے حزیں سے استفتا کیا، اس نے یہ جواب لکھا،

در شعر جمال ار چہ جمالے بکمال است　　اما نہ بہ زیبائی افکار کمال است
لفظش بہ صفا آئینۂ شاہد معنی است　　یعنی بہ شکوہ ست کہ طغرای بلاست
صد بار از سر تا سر دیوانش گزشتم　　لیلی ست کہ سر تا بقدم غنج و دلا است
دریوزہ گر رشحۂ او سند حریفان　　آنکو رگ ابر قلمش بحر نوال است

کمال اور محقق طوسی ہمعصر ہیں، کمال کی بلند پایگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجہ میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیار الاشعار میں کیا ہے،

کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱- بہت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے جن سے متاخرین کی مضمون آفرینیوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے، مثلاً

چوں صبح یاد کرد دہن را بوصف او — چرخش درست مغربی اندر دہاں نہاد

جب صبح نے بادشاہ کی تعریف میں منہ کھولا تو آسمان نے اس کے صلہ میں اسکے منہ میں اشرفی ڈالدی،

افگند چار نعل ہلال، آسماں دو بار — تا بار کاب خواجہ عناں بر عناں نہاد

بیروں فگند چرخ ترازو زباں زکام — از بسکہ بار جود بر و بیکراں نہاد

۲- نہایت مشکل طرحیں کرتے ہیں، اوران میں نئے نئے مضمون پیدا کرتے ہیں، مثلاً،

در گرد عزم او نرسد برق گرم رو — در آتشش بود بہ مثل چوں شرار پائے

از یمن ہمت تو بر آرم چو مور پر — از فرط عجز، اگرچہ ندارم چو مار پائے

ترسم کہ چوں دراز شد ایں شعر ہیچکس — در گوش خویش، جا نہ دہد چوں ہزار پائے (کنکھجورا)

ایک بڑا سیر حاصل قصیدہ لکھا ہے، جس کی ردیف برف ہے،

ہرگز کسے ندیدہ بہ نیساں نشان برف — گوئی کہ لقمہ ایست زمیں، در دہان برف

مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ تعبیہ است — اجرام کوہ گشتہ نہاں در میان برف

۳- زبان کی صفائی اور سلاست کی حد جو ظہیر فاریابی پر ختم ہو چکی تھی، کمال نے اس سرحد کو اور آگے بڑھایا، مثلاً،

سپیدہ دم کہ نسیم بہار سے آید | نگاہ کردم و دیدم کہ یار سے آید
شراب در سر، و چہرہ ز شرم رنگ آمیز | چنیں میانۂ شرم و عفار سے آید
رخش چو شاخِ درخت بہشت و ہر گل از آں | کہ می بچیدم، دیگر بیار سے آید

اس کا چہرہ بہشت کا درخت تھا کہ جو پھول میں چنتا تھا، اس کی جگہ دوسرا کھل آتا تھا،

ز بسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک | چناں نمود مرا کز شکار سے آید
گر فتمش ہمہ رہ در حدیث و او گہ گہ | بقدر حاجت، پاسخ گزار سے آید

میں نے اسے باتوں میں لگایا اور وہ بھی کبھی کبھی بقدر ضرورت جواب دیتا جاتا تھا،

ہر آں فریب کہ از عشوہ بست در کارم | مرا ز سادہ دلی، استوار سے آید
مرا غرور کہ تشریف می دہد، او خود | برائے خدمت صدر کبار سے آید

(یقین — عزت)

ایک قصیدہ میں ممدوح کی لیت و لعل کرنے کی شکایت ہے، ردیف "ہیچ" ہے اور کس سر روانی سے ہر جگہ ادا ہوتی ہے،

صدرا روا مدار کز انعام خود مرا | محروم ماندہ واری و آں را بہانہ ہیچ
ہر روز یا مداد کنم رو بہ درگہت | یک دل پُر از امید و پس آنگہ شبانہ ہیچ
چندیں ہزار تیر معانی و شست طبع | کردم کشادہ و ماند از دو بر نشانہ ہیچ
پنجاہ سال خدمت ایں خانہ کردہ ام | دامر فزنیست ہمرہ من جز فسانہ ہیچ
گر مستحق ہیچ نیم من، بدیں ہنر | پس نیست مستحق عطا در زمانہ ہیچ
از طالعست اینکہ من و آفتاب چرخ | مشہور عالمیم و بر آں آستانہ ہیچ
زاں نمی رسد کہ ترا در خزانہ نیست | یعنی کریم را نبود در زمانہ ہیچ
بر منہج امید من از وعدہا سے تو | دامے است بس شگرف و در آں ام دانہ ہیچ

آگے اور عنوانوں کے نیچے جو اشعار آئیں گے، ان میں صفائی زبان کی خصوصیت پر بھی لحاظ رکھنا چاہیے

۴۔ شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے لچوں کی زبان بن گئی تھی، کمال نے اسکو نہایت لطیف اور پُرمزہ کر دیا، اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ بیہودہ صنف سرے سے اڑا دی جاتی، لیکن ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا، جس سے اُن کے معاش کو تعلق تھا، اسلئے وہ اس سے بالکل دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، امرا و سلاطین جب صلہ کے دینے میں لیت و لعل کرتے تھے تو کمال ہجو اور ظرافت سے کام لیتا تھا، لیکن اس طرح کہ خود اس شخص کو مزہ آئے جس کی ہجو لکھی گئی ہے، ایک دفعہ گھوڑے کے زین ولگام اور دانہ گھاس کے لئے ممدوح سے درخواست کی، دیکھو کس ظریفانہ پیرایہ میں اس مطلب کو ادا کیا ہے

دوشش خربندہ کرد پیشم یاد　　کاسپک خواجہ زندگی بتو داد
(سائیس)
تنگ دل گشتم ازرہ خبرش　　کہ جوان بود و زیرک و استاد
گرچہ غمگین شدم ز واقعہ اش　　گشتم الحق ازاں یکے دلشاد
کہ شنیدم کہ او بہ وقت وفات　　بہ وصیت لب و دہاں بکشاد
از جو و کاہ و از جل و افسار　　ہرچہ بُد در وجوہ خیر نہاد
(گھاس　زین　لگام)　　(یعنی خیرات کیا)
درچناں وقت ایں چنیں توفیق　　ہمہ حیوان خدا بدہاد
داہم گشت تعزیت نامہ　　بتو اے سرور کریم نہاد
بر تو فرض است حق گزاری او　　زانکہ در خدمت لبے استاد
مستحق تر ز اسپ من نبود　　گر وصیت ہمی کنی انفاد
(جاری کرنا)

ہیچ تاخیر بر نتابد خیر   زود تعجیل کن کہ خیرات باد

یعنی کل سائیس نے مجھ سے یہ خبر بیان کی کہ حضور کا گھوڑا مر گیا، مجھکو سخت رنج ہوا لیکن اس خیال سے خوشی بھی ہوئی کہ اس نے مرتے وقت وصیت کی اور جو کچھ اس کے پاس ساز وسامان تھا، سب خیرات کردیا، ایسی توفیق خدا سب کو دے، بہرحال آپ پر اس کا بڑا حق ہے اور آپ کو اس کی وصیت پوری کرنی چاہیئے، لیکن اس وصیت کا مستحق، میرے گھوڑے سے بڑھ کر کوئی نہیں،

ایک بخیل کی، ہجو کی ہے،

دے مرا گفت دوستے کہ مرا   با فلاں خواجہ از پئے دو سہ کار
سخنے چند ہست واز پئے آں   خلوتے مے بباید م ناچار
خلوتے آں چناں کہ اندر وے   ہیچ مخلوق را نباشد بار
گفتم ایں فرصت ار توانی یافت   وقت ناں خوردنش نگہ مے دار

(نگہدار)
(خیال رکھو)

یعنی مجھ سے کل ایک دوست نے کہا کہ فلاں رئیس سے مجھکو مخفی کام ہے، اس لئے میں ایسی تنہائی کا موقع چاہتا ہوں، کہ اس وقت ان کے پاس کوئی نہ ہو، میں نے کہا ایسا موقع صرف اُن کے کھانے کے وقت مل سکتا ہے،

ایک اور بخیل کی، ہجو میں لکھتے ہیں،

ز مرد فانی باور کنم اگر گوید   کہ من بخانۂ خود می خورم طعام حلال
نہ آنکہ مال حلالست، مرد فانی را   کدام مال کہ او دارد و کدام حلال
ولے ز ممسکی آنگاہ مال خویشں خورد   کہ اضطرار مرا ورا شود حرام حلال

یعنی فلاں شخص اگر کہے کہ میں اکلِ حلال کھاتا ہوں تو میں یقین کروں گا، لیکن

نہ اس بنا پر کہ درحقیقت اس کا مال پاک اور حلال ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ کھانا اتنی دیر کے بعد کھاتا ہے، جبکہ مردار بھی حلال ہوجاتا ہے (کم سے کم تین دن کے بعد)

ایک اور بخیل کی ہجو،

بدستِ نانِ خواجہ چو بُردم خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر کہ من ایں لقمہ را فرو بُردم

کسی نے کمال کو بُرا کہا تھا، اس کے جواب میں کہتے ہیں،

شخصے بد ما بہ خلق مے گفت ما از بد او نمے خراشیم
(براہیں مانتے)
ما نیکی او بخلق گفتیم تا ہر دو، دروغ گفتہ باشیم

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ

نظامِ بے نظام ار کافرم خواند چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمان خوانمش زیرا کہ نبود سزا دار دروغے جز دروغے

اسی قطعہ سے ماخوذ ہے،

ایک رئیس سے صلہ کا تقاضا کیا ہے، اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے،

سہ شعر رسم بود شاعرانِ طامع را یکے مدیح، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور نداد ہجا ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شعراء پہلے مدح کرتے ہیں، پھر صلہ کی یاد دہانی کے لیے ایک نظم لکھتے ہیں، اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو شکر یہ لکھتے ہیں، ورنہ ہجو، میں ان تینوں نظموں سے

---

۱ یہ اشعار انوری کی طرف بھی منسوب ہیں،

وہ لکھ چکا ہوں، تیسری کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے،

غزل کی نسبت یہ مسلّم ہے کہ سب سے پہلا خاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہے جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے، خان آرزو مجمع النفائس میں فغانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں،

"قدما را در غزل طرزے بود بسیار سادہ چوں نوبت بہ کمال الدین اسمٰعیل رسید، او رنگے دیگر داد، ابداز و شیخ سعدی و خواجو نمک دیگر ریختند"

کمال نے غزل میں سادگی اور صفائی کیساتھ رنگینی اور جدتِ مضمون بھی پیدا کی، جس کا اندازہ ان مثالوں سے ہوگا،

دوش بکوئش گذشتم و دشنام بہیداد مرا ‏ ‏ ‏ خدمتش کردم و پنداشت کہ من نشنیدم

کل میں ادھر سے گزرا تو وہ مجھکو گالیاں دے رہا تھا، میں نے اسکو سلام کیا اور وہ سمجھا کہ میں نے گالیاں نہیں سنیں،

گرچہ لعلش بہ سزا ناخوشی آنہا می گفت ‏ ‏ ‏ من ازاں خوشتراز و ہیچ سخن نشنیدم

اسکے ہونٹھ گرچہ بری طرح گالیاں دے رہے تھے، لیکن میں نے اس سے زیادہ خوش مزہ کوئی بات آج تک نہیں سنی

زمستاں راست اندازی ندارد چشم کس ہرگز ‏ ‏ ‏ مگر چشمش کہ چوں شد مست ناوک بہتر اندازد

مست آدمی اچھی طرح تیراندازی نہیں کرسکتا لیکن اسکی آنکھیں مستی میں اور زیادہ ٹھیک نشانہ لگاتی ہیں،

چو اندازد بمن تیرے کنم در سینہ پنہانش ‏ ‏ ‏ بداں تا از پئے ہر تیر تیرے دیگر اندازد

از چشمِ نیم خوابِ تو امروز روشن است ‏ ‏ ‏ آں نالہا کہ در غمِ تو دوش کردہ ایم

بودہ ہمیشہ جانِ من رہم تو بے گنہ کشی ‏ ‏ ‏ ہیچ نمی کشی مرا من چہ گناہ کردہ ام

زبان کی سادگی دیکھو،

وے زاں خوبتر تواند بود؟ ہاں بگوئید اگر تواند بود

آنچہ نازک و چناں شیریں لب نباشد، شکر تواند بود

دلِ خود طلب چو کردم بر نرگسِ تو گفتا بر وائے فلاں و بہاں برمت چہ کار دارد

چو بسے بگفتم، او را بکرشمہ گفت بامن سر گفتگو ندارم، کہ مرا خمار دارد

چہ دہی صدائے مستاں چہ کنی حدیث تیز کہ کمینہ ہندوے من بہ ازیں ہزار دارد

نخستم دل بدام اندر کشیدی پس آنگاہم بقلم بر سر کشیدی

بقصد جاں چو من ناتوانے ز روم و ہند و چیں لشکر کشیدی

پراگندہ ہمہ غمہائے عالم ز بہر من، بہ یک دیگر کشیدی

اگرچہ آستیں بر من فشاندی وگرچہ دامن از من در کشیدی

نہ خواہد رفت از یادم کہ بامن شبے تا صبحدم ساغر کشیدی

رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی، قدما اور متوسطین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

گل خواست کہ چوں رخش نکو باشد و نیست چوں دلبر من بزنگ و بو باشد و نیست

صد روے فراہم آور و در سالے شاید کہ یکے چو روے او باشد و نیست

گرلاف زنم کہ یار خوشخوست نہ با ما بہ وفا و عہد نیکوست، نہ

زیں نادرہ تر کہ از برائے تو مرا شہرے ہمہ دشمن اند و تو دوست، نہ

در دیدۂ روزگار کم یا بیئے یا با غم او صبر بہم یا بیئے

یا مایۂ غم چو عمر کم بایستے   یا عمر بہ اندازۂ غم بایستے

یار آمد دوش کردمش مہمانے   ہر چیش گفتم نہ کرد، نا فرمانے
مے خورد و بخفت مست در دامنم   وانگاہ بہ او چہ کردہ باشم دانے

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی[1]

مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، ان کے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے، اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا[2]

سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی، عمر کی مدت تمام تذکروں میں ۱۰۲ برس کی لکھی ہے لیکن اس حساب سے سال ولادت ۵۸۹ھ ہوگا، شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابوالفرج ابن جوزی کے شاگرد ہیں، اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا، جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لیے آئے ہیں، ابن جوزی نے ۵۹۷ھ میں وفات پائی، شیخ کی ولادت اگر ۵۸۹ھ میں مانی جائے تو ابن جوزی کی وفات تک ان کی عمر کل ۹ برس کی ہوگی، اور یہ کسی طرح صحیح نہیں، بعض تذکروں میں شیخ کی عمر ۱۲۰ برس لکھی ہے، اگر یہ خارج از قیاس عمر مان لی جائے تو اور واقعات کی کڑیاں مل جائیں گی لیکن ایک سخت دقت پھر بھی باقی رہتی ہے، وہ یہ کہ شیخ نے گلستاں میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان محمد خوارزم شاہ نے خطا سے صلح کی میں کاشغر میں آیا۔"

سلطان محمد ۵۸۹ھ میں مرا ہے، اس لیے اس زمانہ میں ان کی عمر ۱۸ برس کی ہوگی لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری اور کمالات نے کم از کم ۳۰، ۴۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے، اس لیے یا تو شیخ نے غلطی سے علاء الدین تکش خوارزم شاہ

---

[1] مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا، اس لیے مجبوراً لکھنا پڑا۔

[2] تذکرۂ دولت شاہی۔

کے بجائے محمود خوارزم شاہ کا نام لکھدیا ہے، یا ان کی شاعری کی شہرت اُن کے شباب ہی میں ہو چکی ہوگی،

شیخ کے بچپن کے حالات اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے قلم بند نہیں کیئے لیکن خود شیخ کے کے بیانات سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں،

شیخ کے والد نے شیخ کو جب پڑھنے کے لیے بٹھایا تو لکھنے کی تختی، کاغذ اور ایک طلائی انگوٹھی خرید کر دی، یہ اُس وقت اس قدر کمسن تھے کہ کسی نے مٹھائی دیکر ان سے انگوٹھی اڑالی، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

زعہد پدر یاد دارم ہمے — کہ باران رحمت برو ہر دمے
کہ در طفلیم لوح و دفتر خرید — ز بہرم یکے خاتم زر خرید
بدر کرد ناگہ یکے مشتری — بشیرینی از دستم انگشتری

شیخ کے والد شیخ کو مزید محبت اور تربیت کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، ایک دفعہ عیدگاہ میں ان کو ساتھ لیکر چلے، ہاتھ میں دامن پکڑا دیا تھا کہ ساتھ سے الگ نہ ہو جائیں، راستہ میں بچے کھیل رہے تھے، یہ دامن چھوڑ کر ان میں جا ملے اور باپ کا ساتھ چھوٹ گیا، کشمکش اور ہجوم میں باپ کی صورت نظر نہ آئی، تو گھبرا کر رونے لگے، اتفاق سے باپ نے دیکھ لیا، کان پکڑ کر کہا احمق! تجھ سے کہا نہ تھا کہ دامن نہ چھوڑنا، اس قسم کے واقعات ہر بچہ کو پیش آتے ہیں، لیکن اس سے جو پاکیزہ نتیجہ نکالا کہ

تو ہم طفل راہی بسعی اے فقیر — برو دامن پیر دانا بگیر

شیخ کا کام ہے۔

ان کے باپ ان کی تربیت اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک مرید کو تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے، وہ بات بات پر اُن کو ٹوکتے تھے، اور ان کی غلطیوں پر تنبیہہ کرتے تھے ان کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں زہد و عبادت کا چسکا پڑ گیا تھا، ایک دفعہ حسب معمول باپ کی صحبت میں رات بھر جاگے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے، گھر کے اور آدمی غافل سو رہے تھے، ان کو خیال آیا، باپ سے کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے بے خبر سو رہے ہیں، کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لے، باپ نے کہا جانِ پدر! اگر تم بھی سو رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ لوگوں کی غیبت کر رہے ہو،

بچپن میں جب ان کو وضو کرنا نہیں آتا تھا، محلہ کے ایک مولوی صاحب سے روزہ اور نماز سیکھنی شروع کی، مولوی صاحب نے وضو کے سب آداب و سنن سکھا کر یہ بھی بتایا کہ روزہ میں دوپہر ڈھلنے کے بعد مسواک کرنا منع ہے، پھر کہا کہ ان فرائض کو مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں جانتا ہوگا، گاؤں کا رئیس بالکل بڈھا پھوس ہوگیا ہے رئیس نے سنا تو کہلا بھیجا کہ

ز مسواک در روزہ گفتی خطا است — بنی آدم مردہ خوردن رواست

یعنی تم نے خود بتایا کہ روزہ میں مسواک کرنا منع ہے، لیکن کیا مردہ کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) جائز ہے۔

شیخ کے باپ نے ان کے بچپن ہی میں وفات پائی اور جس ناز و نعم سے پل رہے تھے وہ سامان جاتے رہے، خود کہتے ہیں،

من آنگہ سر تاجور داشتم — کہ سر در کنارِ پدر داشتم

اگر بر د جودم نشستے مگس　　پریشاں شدے خاطر چند کس
کنوں دشمناں گر برندم اسیر　　نباشد کس از دوستانم نصیر[۱]
مرا باشد از درد طفلاں خبر　　کہ در طفلی از سر برفتم پدر

لیکن ان کی والدہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں اور ان سے بھی ان کو اخلاقی سبق ملتے رہتے تھے، گلستاں میں لکھا ہے،

"وقتے از جہل جوانی بانگ بر مادر زدم، دل آزردہ بہ کنجے نشست و گریاں ہمی گفت مگر خوردی را فراموش کردی کہ درشتی می کنی" (باب ششم)

شیراز میں اگرچہ تحصیل علم کا ہر قسم کا سامان مہیا تھا، سیکڑوں علما، فضلاء درس و تدریس میں مشغول تھے، اس کے علاوہ اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی المتوفی ۵۹۱ھ کا مدرسہ موجود تھا، لیکن اس زمانہ میں تحصیلِ کمال کے لئے ممالک دور دراز کا سفر اور مشہور درسگاہوں میں حاضر ہونا لازمی امر خیال کیا جاتا تھا، اس زمانہ میں سب سے بڑا مدرسہ جس کو یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں، نظامیہ بغداد تھا، شیخ نے نظامیہ میں تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ عام طریقہ تھا، مدرسہ سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا، یہ پتہ نہیں چلتا کہ نظامیہ میں انھوں نے کس سے تحصیل علم کی، ان قرائن سے کہ شیخ نے ابن جوزی کی شاگردی کی، ابن جوزی بغداد میں رہتے تھے، شیخ نظامیہ میں حدیث پڑھتے تھے، لوگوں نے نتیجہ نکالا کہ شیخ نے نظامیہ میں ابن جوزی ہی کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا، لیکن مدرسین نظامیہ کی فہرست میں ہم ابن جوزی کا نام نہیں پاتے، بے شبہ ابن جوزی بغداد میں حدیث کا درس دیتے تھے لیکن اپنے مکان پر دیتے ہوں گے، نظامیہ سے ان کا تعلق ثابت نہیں

---

[۱] جامع التواریخ صفحہ ۳۰۰

ہونا،

یہ عجیب بات ہے کہ ابن جوزی کا اثر شیخ کی تعلیم پر نہیں پڑا، ابن جوزی اُن محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں جو حدیث اور روایت میں نہایت سخت احتیاط سے کام لیتے تھے اور مشتبہ اور ضعیف روایتوں کو بالکل ترک کر دیتے تھے، لیکن شیخ اتفاق سے کہیں کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو عموماً ضعیف بلکہ مصنوعی ہوتی ہے، مثلاً

سزد گر بدورش بنازم چناں   کہ سید بہ دوران نوشیرواں

یا مثلاً لی مع اللہ وقت لا یسعہ ملک مقرب الخ

یا مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث زد نی غباً الخ

یا مثلاً طبیب فارس کی حدیث وغیرہ وغیرہ

شیخ کی تحصیل علم کا وہ زمانہ ہے، جب اتابکان فارس کے سلسلہ میں سے سعد زنگی تخت حکومت پر متمکن تھا، وہ نہایت عادل اور صاحب جبروت حکمراں تھا لیکن معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ شیخ کو شیراز میں امن و آسایش سے رہنا نہیں نصیب ہو سکتا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں:

سعدیا! حب وطن گرچہ حدیثیست صحیح   نتواں مرد بہ سختی کہ من آنجا زادم *

غرض شیخ نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر سیر و سیاحت شروع کی اور ایک مدت دراز تک سفر کرتے رہے جس کی مدت عام تذکرہ نویس ۲۰ برس لکھتے ہیں،

سیر و سیاحت کی غرض مختلف ہوتی ہے اور جو غرض پیش نظر ہوتی ہے سیاح اسی حیثیت سے تمام چیزوں کو دیکھتا ہے، بلکہ تمام چیزیں اسی حیثیت سے خود اس کی نظر میں جلوہ گر ہوتی ہیں، شیخ میں کثرت سے مختلف حیثیتیں جمع تھیں، وہ شاعر تھے صوفی

تھے، فقیہہ تھے، واعظ تھے، حسن پرست تھے، رند تھے، شوخ طبع تھے، اس لئے انھوں نے تماشا گاہِ عالم کو ہر ہر پہلو سے دیکھا،

وہ کبھی زہد و ریاضت کے عالم میں حج و زیارت کے لئے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں، نہایت دشوار گذار اور چٹیل صحراؤں میں پیادہ پا سیکڑوں کوس چلے جاتے ہیں، رات رات بھر کی متصل پیادہ روی سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور چلنا دستہ میں پتھریلی زمین پر پڑ کر سو جاتے ہیں، کبھی نفس کشی کے لیے بیت المقدس [illegible] پر مشک رکھکر سقائی کرتے ہیں، لوگوں کو پانی پلاتے پھرتے ہیں، کبھی صاحب دل درویش کا تذکرہ سنکر اس کی زیارت کے لیے روم پہنچتے ہیں، کبھی انبیاء کے مزارات پر اعتکاف کرتے ہیں، جمعہ کا دن ہے، نماز کو جانا چاہتے ہیں، لیکن پاؤں میں جوتی نہیں، دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے، دفعۃً ایک شخص پر نظر پڑتی ہے، جس کے سرے سے پانوں ہی نہیں صبر آجاتا ہے، اور سمجھ جاتے ہیں کہ صبر و رضا کی تعلیم ہے۔

ایک دفعہ لوگوں کی صحبت سے تنگ آکر بیت المقدس کے صحرا میں بادیہ پیمائی شروع کی، اتفاق سے عیسائیوں نے پکڑ لیا، اور طرابلس (طرپولی) میں خندق کھودنے کے کام پر لگا دیا، بہت پریشان ہوئے، لیکن مجبور تھے، اتفاق سے ایک قدیم دوست کا ادھر گذر ہوا، پوچھا خیر ہے؟ فرمایا،

همی گریختم از مردمان بکوه و بدشت		که از خدای نبودم بدیگری پرداخت
قیاس کن که چه حالت بود درین ساعت		که با طویلهٔ نامردمم بباید ساخت

یعنی جو شخص آدمیوں سے بھاگتا پھرتا تھا، جب جانوروں میں پھنس جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی، دوست کو رحم آیا، فدیہ دیکر ان کو چھڑایا، اور اپنے ساتھ

حلب میں لائے مزید عنایت سے سو اشرفی مہر پر اپنی بیٹی کیساتھ شادی کر دی لیکن صاحبزادی نہایت شوخ اور زبان دراز تھیں شیخ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی، ایک دن کہنے لگیں تم اپنی ہستی بھول گئے، تم وہی تو ہو کہ میرے باپ نے دس دینار دیکر تم کو چھڑایا، شیخ نے کہا ہاں دس دینار دیکر چھڑایا، لیکن سو دینار کے عوض پھر گرفتار کرا دیا،

شیخ نے تصوف و سلوک کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی المتوفی سنہ ۶۳۲ھ سے حاصل کی، اسی سیاحت کی بدولت سفر دنیا میں ان کا ساتھ ہوا، اور ان کے فیض صحبت سے شیخ نے تزکیۂ نفس کے مراتب طے کئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

مرا پیر دانائے فرخ شہاب — دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش — دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

ایک دفعہ بعلبک کی جامع مسجد میں کھڑے تھے اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید کا نکتہ بیان فرما رہے تھے، کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا، تاہم یہ اپنے عالم میں مست تھے اور یہ شعر زبان پر تھا،

دوست نزدیک تر از من بہ من است — وین عجب تر کہ من از وے دورم
چہ کنم باکہ توان گفت کہ او — در کنار من و من مہجورم

اتفاق سے کوئی صاحب دل آنکلے، انھوں نے بیساختہ نعرہ مارا، ان کے اثر سے مجلس کی مجلس گرما گئی، شیخ کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ "دوران با بصر نزدیک نزدیکان بے بصر دور" ایک دفعہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے قاضی کے دربار میں گئے اور اونچی صف میں جا کر بیٹھے، قاضی صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھا اور میر دربار نے جو لوگوں کو حسب مدارج بٹھانے پر مامور تھا، ان کے پاس آکر کہا،

ندانی کہ برتر مقامِ تو نیست فروتر نشیں یا برو یا بایست

بیچارے وہاں سے اٹھ کر صف پائیں میں آ کر بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد حسب معمول کسی فقہی مسئلہ پر بحث چھڑی اور ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں، لیکن کوئی شخص کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتا تھا کہ سب اس کے سامنے سر جھکا دیں، شیخ کو اظہار کمال کا موقع ملا، صفِ پائیں سے للکار کر کہا،

کہ برہان قوی باید و معنوی نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی

لوگوں نے ان کی طرف توجہ کی، انھوں نے اس خوبی سے اس مسئلہ کو سلجھا کر ادا کیا کہ سب مان گئے، یہاں تک کہ خود قاضی صاحب صدر مجلس سے اٹھے اور اپنی پگڑی اتار کر ان کے سر پر رکھ دی،

اس زمانہ میں اتنا انصاف بھی تھا، آج کا دن ہوتا تو کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا،

اسکندریہ کے مشہور قحط میں جس میں لوگ بھوک کے مارے آدمی کو زندہ بھون کر کھا جاتے تھے، ایک دولت مند مخنث نے اپنا خوانِ کرم اس قدر وسیع کر رکھا تھا کہ کسی شخص کے لئے روک نہ تھی، شیخ اس زمانہ میں اسکندریہ ہی میں تھے، ان کے دوستوں نے ان سے کہا کہ مخنث کی دعوت میں چلنا چاہئے ان کی خودداری نے گوارا نہ کیا، اور کہا،

نخورد شیر نیم خوردۂ سگ ورز سختی بمیرد اندر غار

شیخ کی آزادہ روی اور تجرد کے الفاظ سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اہل و عیال کا جھگڑا نہیں خریدا ہوگا لیکن تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ انھوں نے

اس تجربہ گاہ کی بھی سیر کی، ایک دفعہ تو وہی مجبوری کا تعلق اختیار کرنا پڑا تھا جس کا ذکر اوپر گذر چکا، دوسری دفعہ صنعا، (یمن کا صدر مقام) میں نکاح کا اتفاق ہوا، اور اس سے اولاد ہوئی لیکن بچپن ہی میں جاتی رہی، باوجود آزادی کے شیخ کو اس کا بہت صدمہ ہوا، چنانچہ خود بوستاں میں فرماتے ہیں،

بصنعا درم طفلے اندر گذشت چہ گویم کز انم چہ بر سر گذشت

یہاں تک سوا اس بات کے ہوئے کہ قبر کا ایک تختہ اٹھا کر لخت جگر کو دیکھنا چاہا، لیکن ہولناک منظر دیکھ کر کانپ اٹھے اور غشی سی طاری ہوگئی، ہوش میں آئے تو فرزند دلبند نے زبان حال سے کہا

شب گور خواہی منور چو روز از ینجا چراغ عمل بر فروز

جس زمانہ میں سلطان خوارزم شاہ نے خطا والوں سے صلح کرلی، شیخ کاشغر میں آئے جامع مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس میں حسب دستور درسیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، سیر کرتے کرتے مدرسہ میں آئے، ایک خوش جمال لڑکا زمخشری کی کتاب (غالباً مفصل ہوگی) پڑھ رہا تھا اور یہ فقرہ زبان پر تھا ضرب زید عمرا، شیخ نے کہا خوارزم و خطا میں صلح ہوگئی اور زید اور عمر کا جھگڑا اب تک ختم نہیں ہو چکا، لڑکا ہنس پڑا، اور ان کا نام و نشان پوچھا، انھوں نے کہا شیراز، شیخ کا شہرہ عالمگیر ہو چکا تھا، شیراز کا نام سنکر اس نے کہا سعدی کے شعر بھی کچھ آپ کو یاد ہیں؟ انھوں نے عربی کے دو شعر اسی وقت موزوں کرکے پڑھے، لڑکا سمجھ نہ سکا، بولا کہ ہمارے ملک میں تو ان کے فارسی شعر مشہور ہیں، آپ فارسی شعر پڑھئے تو میں سمجھ سکوں، شیخ نے برجستہ کہا،

اے دل عشاق بدام تو صید ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

دوسرے دن کسی نے لڑکے سے کہدیا کہ یہی سعدی ہیں، وہ دوڑا ہوا شیخ کے پاس گیا

اور نہایت اخلاص و عقیدت ظاہر کی، اور کہا کہ آپ نے نام کیوں نہیں ظاہر فرمایا کہ میں خدمت گذاری کی سعادت حاصل کر سکتا، شیخ نے جواب دیا ع

با وجودت ز من آواز نیاید کہ منم — تیرے سامنے میں یہ کہہ سکا کہ میں ہوں۔

لڑکے نے عرض کی کہ چند روز آپکا قیام ہوتا تو سب آپ سے مستفید ہوتے، شیخ نے کہا نہیں، میں نہیں ٹھہر سکتا، پھر یہ اشعار پڑھے،

بزرگے دیدم اندر کوہسارے — قناعت کردہ از دنیا بہ غارے
بدو گفتم بہ شہر اندر نیائی — کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویان نغزند — چو گل بسیار شد پیلان بلغزند

وقت کی تہذیب دیکھو! شیخ جیسا مقدس اور صوفی منش ایک امرد کو گلے لگاتا ہے پیار کرتا ہے، منھ چومتا ہے اور پھر دیدہ دلیری سے کہتا ہے،

ایں بگفتیم و بوسہ چند بر سر و روی یک دیگر دادیم و وداع کردیم،

بوسہ دادن بروی یار چہ سود — ہم دراں لحظہ کردنش پدرود

اسی عالم سیاحت میں شیخ ہندوستان میں بھی آئے، عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ امیر خسرو سے ملے تھے، لیکن مستند تاریخوں میں اسی قدر ہے کہ امیر خسرو کے ممدوح خان شہید[1] نے دو[2] دفعہ شیخ کو شیراز سے طلب کیا، لیکن شیخ نے بڑھاپے اور ضعف کا عذر کیا، اور گلستان و بوستان اپنے ہاتھ سے لکھ کر تحفہ میں بھیجی،

خان شہید نے امیر خسرو کا کلام بھی بھیجا تھا، شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدر دانی کے قابل ہے،

---

[1] خان شہید نے سنہ ۶۸۲ھ میں شہادت اور شیخ سعدی کے بلانے کا واقعہ اسی سنہ کے دو چار برس قبل کا واقعہ ہے،

ہندوستان کے سفر کا ایک واقعہ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے لیکن بیان واقعہ میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ مشتبہ ہو جاتا ہے، ان کا بیان ہے کہ سومنات میں آئے، یہاں ایک عظیم الشان بت خانہ تھا، پوجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی، ایک دن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت تعجب ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں، وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بت خانہ میں یہ چرچا پھیل گیا، سب اُن پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، انھوں نے کہا کہ بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں، لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے، برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے، میں نے بھی بہت سفر کئے، اور ہزاروں بت دیکھے، لیکن جو معجزہ اس میں ہے کسی میں نہیں، ہر روز صبح کو دعا کے لیے خود ہاتھ اٹھاتا ہے، چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے، تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا اور بت خانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پجاری مندر میں رہا کرتے ہیں، برہمنوں کو جب ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا، تو ایک دن بت خانہ کا پھاٹک بند کر کے چاروں طرف نظر دوڑائی، دیکھا تو بت کی پشت کی طرف ایک زرفق پردہ ہے، پردہ کے اوٹ میں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جس کے ہاتھ میں ایک رسی ہے، رسی کیا بت کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اندر سے یہ شخص رسی کو کھینچتا ہے تو ہاتھ اٹھ جاتے ہیں، ان کو دیکھکر وہ شخص بھاگا، انھوں نے تعاقب کر کے اسکو کوئیں میں ڈھکیل دیا اور خود بھاگ نکلے۔

ان واقعات کے بیان میں عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بنا ہوا بتایا ہے حالانکہ ہاتھی دانت کو ہندو پاک نہیں سمجھتے اسلئے اس کا بت نہیں بنا سکتے، برہمنوں کو لکھا

ہے کہ وہ پاژند پڑھتے تھے،

فتادند گبران پاژند خواں ۔ چو سگ بامن از بہرآں استخواں

حالانکہ پاژند ہندوؤں کی کتاب نہیں بلکہ پارسیوں کا صحیفہ ہے،

برہمنوں کو کہیں گبر اور کہیں مطران کہتے ہیں،

پس پردہ مطران آذر پرست

حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے ہیں، پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے، ان جزئیات کے سوا اصلی واقعہ بھی نہایت دور از قیاس ہے، شیخ کتنی ہی بت پرستی کرتے، لیکن یہ ناممکن تھا کہ ایک ایسے عظیم الشان بت خانہ میں تمام برہمن اور پجاری اکیلے ان کے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جاتے، اور ان کو یہ موقع ملتا کہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے چھپا پتے کرتے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ نازہ ولایت تھے، خدا جانے کس چیز کو کیا سمجھے اور کس واقعہ کو کیوں کر لکھ گئے، اکثر انگریز سیاحوں کا یہی حال ہے، دو چار دن ہندوستان میں رہ سفرنامے لکھتے ہیں جن کو پڑھکر ہندوستانیوں کو غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس ملک کی داستان ہے، شیخ نے اس حکایت کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ سومنات سے میں ہندوستان میں آیا، غالباً اس زمانہ میں ہندوستان خاص دہلی اور نواح دہلی کو کہتے ہوں گے، لیکن شیخ نے کچھ زیادہ تصریح نہیں کی اور نہ کہیں سے پتہ لگتا ہے کہ کہاں تک پہنچے تھے،

شیخ نے جب سیاحت شروع کی تو فارس میں اتابکان سلغری کی حکومت تھی، یہ سلسلہ بھی اور سلسلوں کی طرح سلجوقیوں کا دست پرورد تھا، اس سلسلہ کا پانچواں حکمران سعد زنگی شیخ سعدی کا ہمعصر تھا لیکن اس کے اخیر زمانہ تک سعدی وطن میں نہیں آئے

صاف نہیں کھلتا کہ اس کے اسباب کیا تھے لیکن شیخ کی بعض تلمیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو اس زمانہ میں امن وامان کی طرف سے اطمینان نہ تھا، سعد زنگی نے سنہ ۶۲۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اتابک ابوبکر بن سعد زنگی تخت نشین ہوا، وہ نہایت شان وشوکت کا بادشاہ تھا، فارس کی حکومت جو دو برس سے تاراج گاہ بن رہی تھی، اس کے زمانہ میں عروس رعنا بن گئی، ہر طرف نظم ونسق قائم ہو گیا، جابجا مدرسے اور درس گاہیں کھل گئیں، علماء و فضلاء و شعرا دور دور سے کھنچ آئے، شیخ ہمیشہ وطن کے شوق میں بیتاب رہتے تھے، اور وطن پہنچنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں،

چہ خوش سپیدہ دمے باشد آنکہ بینم باز	رسیدہ بر سر اللہ اکبر[1] شیراز
نہ لائق ظلمات ست باللہ این اقلیم	کہ تختگاہ سلیمان بدست حضرت راز

اب جو امن وامان کی طرف سے اطمینان ہوا تو شام سے عراق وعجم ہو کر شیراز میں آئے چنانچہ ایک قطعہ میں غریب الوطنی اور مراجعت کی وجہ بتصریح لکھی ہے،

ایک قطعہ میں اس بھی زیادہ صاف لکھا ہے،

ندانی کہ من در اقالیم غربت	چرا روزگارے بکردم درنگی
برون رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم	جہاں درہم افتادہ چوں موئے زنگی
ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن	چو گرگاں بہ خونخوارگی تیز چنگی
چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم	پلنگاں رہا کردہ خوئے پلنگی
چناں بود در عہد اول کہ دیدم	جہاں پر ز آشوب و تشویش و تنگی

[1] اللہ اکبر شیراز کے ایک چشمہ کا نام ہے،

چنیں شد در ایام سلطان عادل — اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

شیراز پہونچکر شاہی تعلقات سے بالکل آزاد رہنا تو ممکن نہ تھا، ابوبکر بن سعد زنگی کے درباریوں میں داخل ہوئے، مدحیہ قصائد لکھے، گلستان اور بوستاں اسی کے نام سے معنون کی، غالباً صلے بھی (بلا طلب) ملے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آزاد مزاجی کی وجہ سے دربار کے قابل نہ تھے اور ابوبکر بن سعد نے اس وجہ سے ان کی چنداں قدردانی نہیں کی، چنانچہ ایک قصیدہ میں ہلکی سی شکایت بھی کی ہے،

بہ دولت ہمہ افتادگان بلند شدند — چو آفتاب کہ بر آسماں برد شبنم
مگر کمینہ آحاد بندگان سعدی — کہ سعیش از ہمہ بیش است و خطش از ہمہ کم

انکیانو جوابا قا آن خاں (پسر ہلاکو خاں) کی طرف سے خاندان اتابک کے انقراض کے بعد شیراز کا گورنر مقرر ہوا تھا، اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں،

سعدیا چنداں کہ میدانی بگو — حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع در کار نیست — از خطا باکش نباشد وز تتار

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایشیائی درباروں میں کیونکر فروغ پا سکتے تھے غرض ابوبکر بن سعد نے تو ان کے رتبہ کے موافق ان کا احترام نہ کیا، لیکن جو امراء صاحب علم و فضل تھے وہ شیخ کی پرستش کرتے تھے،

اس زمانہ میں علم و فضل کے اصلی پشت پناہ شمس الدین صاحب دیوان اور علاء الدین تھے

خواجہ شمس الدین، ہلاکو خاں کا وزیر اعظم تھا اور ہلاکو خاں کے زمانہ میں باوجود اختلاف مذہب اور تاتاریوں کی سفاکی کے اسلام کا جو نام و نشان رہ گیا

وہ صرف خواجہ شمس الدین کا صدقہ تھا، تاتاریوں میں جو اسلام پھیلا وہ بھی خواجہ شمس الدین ہی کی بدولت تھا، سب سے پہلے اس سلسلہ میں نکودار (ہلاکو خاں کا بیٹا) اسلام لایا اور سلطان احمد کے لقب سے ملقب ہوا، نکودار نے خواجہ شمس الدین ہی کی ہدایت اور ترغیب کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا،

خواجہ شمس الدین کا دوسرا بھائی علاء الدین ہلاکو خاں کی طرف سے بغداد کا حاکم تھا اور نہایت صاحب فضل و کمال تھا تاتاریوں کی سب سے مفصل اور مستند تاریخ جہانکشا اسی کی تصنیف ہے، یہ دونوں بھائی شیخ سعدی کے مرید اور معتقد خاص تھے، شیخ ایک دفعہ جب حج سے واپس آکر تبریز میں آئے جو ہلاکو خاں کا پایۂ تخت تھا تو خواجہ شمس الدین سے ملنے گئے، اتفاق یہ کہ ادھر سے اباقاآن خان (پسر ہلاکو خان) کی سواری آرہی تھی، خواجہ شمس الدین اور علاء الدین بھی ساتھ تھے، شیخ نے اس خیال سے کہ تعارف کا یہ موقع نہیں، چاہا کہ نظر بچا کر نکل جائیں، اتفاق سے دونوں بھائیوں نے ان کو دیکھ لیا، گھوڑوں سے اتر پڑے اور جا کر شیخ کے ہاتھ پاؤں چومے اباقاآن خاں دیکھ رہا تھا، اس کو سخت حیرت ہوئی کہ برسوں سے یہ میرے دربار میں رہا اور نمک خوار ہیں، تاہم جو تعظیم انھوں نے اس بوڑھے کی کی، میری بھی کبھی نہیں کی، جب دونوں بھائی شیخ سے رخصت ہو کر جلوس میں شامل ہوئے، تو اباقاآن نے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ جس کی تم نے اس قدر تعظیم و تکریم کی، انہوں نے کہا، یہ ہمارا باپ تھا، اباقاآن نے کہا کہ تمہارا باپ تو مرچکا ہے، بولے کہ پدر طریقت ہے، حضور نے سعدی کا نام سنا ہوگا جن کی نظم و نثر آج تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے، وہ یہی بزرگ ہیں، اباقاآن ملنے کا مشتاق ہوا، دوسرے دن دونوں بھائی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کا پیغام کہا، شیخ نے انکار کیا، لیکن ان لوگوں نے اس قدر اصرار کیا کہ شیخ کو چارنا چار

جانا پڑا، اباقاآن سے دیر تک صحبت رہی، چلتے چلتے اس نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرمانے جائیے، شیخ نے کہا مرنے کے بعد صرف اعمال ساتھ جائیں گے اب تم کو اختیار ہے کہ اچھے اعمال ساتھ لے جاؤ یا برے، اباقاآن نے کہا اس مضمون کو نظم کر دیجئے شیخ نے برجستہ کہا،

شہے کہ حفظ رعیت نگاہ می دارد　　　حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است
وگرنہ راعی خلق است زہر مارش باد　　　کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

اباقاآن کے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، اور کہا کہ میں راعی ہوں یا نہیں، شیخ نے کہا کہ اگر راعی ہو تو پہلا شعر حسب حال ہے، ورنہ دوسرا، اباقاآن بار بار پوچھتا تھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ لیکن شیخ ہر بار وہی شرطیہ جواب دیتے رہے، چلتے ہوئے شیخ نے یہ اشعار پڑھے،

بادشہ سایۂ خدا باشد　　　سایہ با ذات آشنا باشد
نشود نقل عامہ قابل خیر　　　گر نہ شمشیر بادشا باشد
مملکت اوصلاح نپذیرد　　　گر ہمہ رائے او خطا باشد
ہر صلاحے کہ در جہاں آید　　　اثر عدل بادشاہ باشد

اباقاآن پر ان اشعار کا نہایت اثر ہوا،

ایک دفعہ خواجہ شمس الدین نے چند سوالات لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے، اس کے ساتھ ایک عامہ اور پانچسو اشرفیاں بھی بھیجیں، لیکن قاصد نے ڈیڑھ سو اشرفیاں خود اڑالیں، شیخ نے سوالات کے جواب کے ساتھ اشرفیوں کی رسید بھی لکھی اور عجیب لطیف [illegible] نوکر کی خیانت ظاہر کی،

چوں تشریفم فرستادی و مال — مالت افزوں باد و خصمت پائمال

ہر بہ دیناریت سالے عمر باد — تا بمانی سیصد و پنجاہ سال

یعنی آپ کو خدا ہر اشرفی کے بدلے ایک برس عمر دے تاکہ آپ ۳۵۰ برس زندہ رہیں، خواجہ شمس الدین نے نوکر سے باز پرس کی، خواجہ علاء الدین (برادر خواجہ شمس الدین) نے جلال الدین ختنی کو جو شیراز میں ایک معزز عہدہ پہ مامور تھے، خط لکھا کہ دس ہزار اشرفیاں شیخ کی خدمت میں پہنچا دینا، سوء اتفاق یہ کہ جب نوکر شیراز میں پہنچا تو اس سے چھ دن پہلے جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا، نوکر نے جلال الدین کے نام کا خط شیخ کو دے دیا، شیخ نے علاء الدین کو جواب میں یہ قطعہ لکھا،

پیام صاحب دولت علاء دولت و دیں — کہ دین و دہر بہ ایام او ہمے نازد

رسید پایۂ دولت فزود سعدی را — بسے نماند کہ سر بہ فلک برافرازد

مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین — قبول خدمت او را التہدے سازد

ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود (فرمان) — چنانچہ بر سر ابنائے دہر می تازد

جلال زندہ نخواہد شدن دریں دنیا — کہ بندگان خدا وند گار بنوازد

طمع ندارم از و در سرائے عقبیٰ نیز — کہ از مظالم مردم بہ ما بپردازد

یعنی اس کا تو چنداں رنج نہیں کہ جلال الدین اب زندہ نہیں ہو سکتا کہ میری حق رسی کر سکے، رونا یہ ہے کہ قیامت میں بھی اس کو اوروں کی دادرسی سے اتنی فرصت کہاں ہو گی کہ ہم غریبوں کی طرف متوجہ ہو،

خواجہ شمس الدین نے قطعہ پڑھ کر حکم دیا کہ فوراً پچاس ہزار اشرفیاں شیخ کی خدمت میں بھیج دی جائیں، شیخ قبول نہیں کرتے تھے، لیکن چونکہ خواجہ موصوف نے

قیمیں دلائی تھیں، شیخ نے اس رقم سے ایک کاروان سرا تعمیر کرا دی[1]

خواجہ شمس الدین کو ارغون خان (ہلاکو خان کا پوتا) نے ۶۸۳ھ میں قتل کرا دیا، ان کے بعد بھی شیراز کے تمام حکام اور امرا شیخ کی اسی طرح عزت اور تعظیم کرتے رہے، ملک عادل شمس الدین تازی کے زمانہ میں عمال نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ سرکاری باغوں کے پھل نہایت گراں قیمت پر زبردستی دکانداروں کے ہاتھ بیچتے تھے، اور بیچاروں کو خواہ مخواہ مول لینا پڑتا تھا، شیخ کے بھائی بقالی کا پیشہ کرتے تھے، ان کی دوکان اتابک کے محل کے سامنے تھی، ان پر بھی چند بار یہ آفت آئی، آخر مجبور ہو کر بھائی کے پاس آئے، شیخ نے یہ قطعہ لکھ کر ملک عادل کے پاس بھیجا۔

ز احوال برادرم بہ تحقیق   دانم کہ ترا خبر نباشد
خرمای بہ طرح می دہندش   بخت بد ازیں بتر نباشد
اطفال برند و مرد درویش   خرما بخورند و زر نباشد
انگہ تو محصلے فرستی   شخصے کہ ازو بتر نباشد
چنداں بزنندش اے خداوند   کز خانہ رہش بدر نباشد
اے صاحب من بعون او رس   لطفے بہ ازیں دگر نباشد

ملک شمس الدین نے قطعہ پڑھتے کے ساتھ منادی کرا دی کہ جن لوگوں سے ایسا معاملہ کیا گیا ہے، سب دربار میں حاضر ہوں، چنانچہ سب کی دادرسی کی، پھر شیخ کی خدمت میں آیا اور نہایت معذرت کی، ساتھ ہی ہزار اشرفیوں کی تھیلی پیش کی کہ آپ کے بھائی کے نقصان کا تاوان[2] ہے،

---

[1] یہ تمام حالات احمد بن بیستون نے کلیات شیخ کے دیباچہ میں لکھے ہیں [2] دیباچۂ کلیات

شیخ نے آخر زندگی میں شہر سے باہر ایک زاویہ بنوا لیا تھا، رات دن وہیں رہتے تھے اور عبادت کرتے تھے، سلاطین اور امراء اسی آستانہ پر حاضر ہوتے اور مراتب اخلاص بجا لاتے، کھانے کا یہ انتظام تھا کہ امراء خود کھانے لیجاتے یا بھجوا دیتے، شیخ جس قدر کھا سکتے کھا لیتے، باقی ایک زنبیل میں رکھ کر دیوار سے لٹکا دیتے کہ ؏

بر چنیں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

شیخ جب شیراز میں واپس آئے تو ابوبکر بن سعد کی حکومت کا زمانہ تھا، اس کے بعد اس کا پوتا محمد بن سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ وہ نہایت صغیر سن تھا، حکومت کے سب کام اس کی ماں انجام دیتی تھی، دو برس ۷ مہینے کے بعد مر گیا، اس کے بعد محمد شاہ بن سلغر بن اتابک سعد بادشاہ ہوا لیکن سفاک اور خوں ریز تھا، اس لیے آٹھ مہینے کے بعد ارکان دولت نے اس کو گرفتار کیا اور ہلاکو خاں کے پاس بھیج دیا، پھر اس کے بھائی نے برائے نام حکومت کی اور ۶۶۳ھ میں قتل کر دیا گیا، اب اس خاندان میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا، آبش خاتون دختر اتابک سعد مسند حکومت پر بیٹھی، اس نے ہلاکو خاں کے بیٹے منکو تیمور سے شادی کر لی، ۶۸۶ھ میں وہ بھی مر گئی اور اب شیراز و فارس براہ راست تاتاریوں کی زیر حکومت آ گیا،

یہ ارغون خاں ابا قاآن بن ہلاکو خاں کا زمانہ ہے، شیخ نے اس کے عہد حکومت میں ۶۹۱ھ میں وفات پائی، تاریخ وفات "خاص" کے لفظ سے نکلتی ہے کسی نے اس کو موزوں کر دیا ہے ؏ زخاصان بود زاں تاریخ شد خاص،

شیخ کا مزار مقام دلکشا سے کچھ فاصلہ پر پہاڑ کی تلی میں ہے، اور اب سعدیہ کے نام سے مشہور ہے، ہفتہ میں ایک دن مقرر ہے لوگ زیارت کو جاتے ہیں، دن بھر

وہیں رہتے ہیں، چائے پیتے ہیں، لطف اٹھاتے ہیں اور شام کو چلے آتے ہیں،

عام حالات اور اخلاق وعادات | شیخ نے گو اپنے سوانح نہیں لکھے، لیکن گلستان اور بوستان میں جستہ جستہ ضمنی موقعوں پر اس قدر حالات لکھ دیئے ہیں، کہ ان سے اخلاق اور عادات کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے،

شیخ کا شمار صوفیہ کبار میں ہے اور بے شبہہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے، لیکن انکی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے، اُن کی اصلی سرشت یہ نہ تھی، بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑ پن کے زمانہ تک اُن میں وہ اوصاف نظر آتے ہیں جو مولویوں کا خاصہ ہیں، یعنی خود بینی، حرف گیری، مشاجرت ومخاصمت، باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق شوق پیدا ہو گیا ہے، شب بیداری اور ورد و وظائف میں مصروف ہیں، لیکن ساتھ ہی اوروں پر حرف گیری بھی کرتے جاتے ہیں کہ دیکھئے کسی کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی،

نظامیہ میں حدیث پڑھتے ہیں، کسی نے ان کے خلاف کچھ کہہ دیا ہے، اس پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں،

چو من داد معنی دہم در حدیث   بر آید ہم اندرونِ خبیث

ایک درویش سے دولت مندی اور درویشی کے متعلق بحث کرتے کرتے دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور دھول دھپہ تک نوبت پہنچا دیتے ہیں،

"دشنام داد، سقطش گفتم، گریبانم درید، زنخدانش شکستم"

حج کا سفر ہے، ذوق وشوق میں احرام باندھے پاپیادہ جا رہے ہیں، اس حالت میں بھی زبان سے ناسزا کلمات نکل رہے ہیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

در سرودی ہمہ گر بفتادیم و داد فسق و جدال دادیم

حسن پسندی امرد پرستی تک پہونچ گئی ہے، اور ایسے کھیل کھیلے ہیں کہ اس کا ذکر تک نہیں کیا جا سکتا،

بے شبہ یہ باتیں ان کے عارفِ کامل کے داغ ہیں لیکن ایک رفتار مرادِ مصلح کے کے لیے ان تمام مراحل سے گذرنا ضرور تھا،

مولانا روم سے کسی نے ایک بزرگ کی نسبت کہا کہ "شاہد باز بود اما پاکباز بود" مولانا نے کہا "کاش کردی و گذاشتی"

شیخ نے چونکہ بیماریاں اٹھا کر صحت پائی تھی اس لیے وہ امراض (اخلاقی) کی حقیقت، ماہیت، علامات اور طریق علاج سے جس قدر واقف ہو سکے دوسرا نہیں ہو سکتا تھا، اخلاقی بیماریوں میں اکثر دل کو دھوکا ہوتا ہے اور مرض کو مرض نہیں سمجھتے، مثلاً ایک فقیہ فطری بدنفسی کی وجہ سے اپنے مخالف کو برا کہتا ہے اور اس کو ضرر پہونچاتا ہے، لیکن اس کا نفس اس کو یہ دھوکا دیتا ہے کہ چونکہ یہ شخص فلاں مسئلہ کا قائل ہے، بدعتی اور کافر ہے اس لیے اس کو برا کہنا اور اس کی تکفیر کرنا غیرتِ مذہب کا اقتضا ہے، یا مثلاً ایک صوفی صاحب امرد پرستی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے، شیخ ان غلطیوں میں نہیں پڑ سکتا، چنانچہ امرد پرستی کی نسبت، نظر باز صوفیہ کی اس طرح پردہ دری کرتا ہے،

گروہے نشینند با خوش پسر ۔۔۔ کہ ما پاکبازیم و اہل نظر
ز من پرس فرسودۂ روزگار ۔۔۔ کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار
چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد ۔۔۔ کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خرد

شیخ کے مزاج میں ظرافت حد سے زیادہ تھی، ایک دفعہ ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے، ایک یہودی پڑوس میں رہتا تھا، اس نے کہا ضرور خرید لیجئے، میں اس مکان کی حالت سے خوب واقف ہوں، اسمیں کوئی عیب نہیں، شیخ نے کہا بجز اسکے کہ آپ اسکے ہمسایہ ہیں،

خواجہ ہمام ایک مشہور شاعر تھے اور محقق طوسی کے شاگرد تھے، شیخ سے اور ان سے تبریز میں ایک حمام میں ملاقات ہوئی، شیخ نے دانستہ ہمام سے چھیڑ چھاڑ شروع کی، ہمام ان سے واقف نہ تھے نام اور نشان پوچھا، شیخ نے کہا شیراز میں رہتا ہوں، ہمام نے کہا عجیب بات ہے، ہمارے شہر میں شیرازی کتوں سے زیادہ ہیں، شیخ نے کہا ہاں، لیکن شیراز میں تو تبریزی کتے سے بھی کم (رتبہ) ہیں، اتفاق سے ایک خوشرو نوجوان ہمام کو پنکھا جھل رہا تھا، شیخ اس سے لطف نظر اٹھانا چاہتا تھا لیکن ہمام بیچ میں حائل تھے، ہمام نے سلسلۂ سخن میں کہا کہ شیراز میں ہمام کے شعر کا بھی چرچا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں یہ شعر اکثر زبانوں پر ہے،

در میان من و دلدار حجاب است ہمام   وقت آن است کزین پردہ بیک سو فگنم

ہمام کو گمان ہوا کہ یہ سعدی ہیں، قسم دلا کر پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ شیخ نے مجبوراً بتایا، ہمام نے اٹھ کر شیخ کے پاؤں پر سر رکھ دیا، گھر لے گئے اور بڑی گرمجوشی سے مہمانیاں کیں[1]،

مجد الدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اسی دربار سے تعلق رکھتے تھے جس سے شیخ کو تعلق تھا، آج تو کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا، لیکن اس زمانہ میں فارس کی ملک الشعرائی کا منصب جو شیخ کا حق تھا، قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا، سعد بن ابوبکر سعد زنگی ان کی تعظیم و تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا، اسی

---

[1] دولت شاہ ذکر سعدی،

زمانہ میں امامی ایک شاعر تھا، زمانہ کی بے بصری نے اُن کو بھی شیخ کا حریف بنا رکھا تھا، نوبت یہاں تک پہونچی کہ خواجہ شمس الدین محمد اور ملک معین الدین پروانہ اور نور الدین اور افتخار الدین نے یہ قطعہ لکھ کر مجد الدین ہمگر کے پاس بھیجا،

ز شمعِ فارس، مجد ملت و دین ۔۔۔ سوالے می کنند بے دانشِ روم
دو شاگرد اند تو ہستند حاضر ۔۔۔ رہی و افتخار و نور معلوم
تو از اشعار سعدی و امامی ۔۔۔ کرامی بہ پسندی اندریں بوم

مجد الدین نے جواب میں لکھا،

اگرچہ بہ نطق طوطی خوش نفسیم ۔۔۔ بہ شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماعِ امم ۔۔۔ ہرگز من و سعدی بہ امامی نرسیم

شیخ کو بھی اس بے امتیازی کا رنج ہوا، چنانچہ رباعی لکھی،

ہر کس کہ بہ بارگاہ سامی نرسد ۔۔۔ از بختِ سیاہ و بدکلامی نرسد
ہمگر کہ بہ عمر خود نکردہ است نماز ۔۔۔ شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

شیخ کے سیر و سفر کے ذکر میں جو واقعات ہم اوپر لکھ آئے ہیں اُن کو اس موقع پر دوبارہ پڑھنا چاہئے، جن سے شیخ کے اخلاق و عادات کی تصویر پوری نظر میں آجائے گی۔

شیخ کی تصانیف | کلیات شیخ[۲] کا قدیم ترین قلمی نسخہ کتب خانہ دیوان ہند (INDIA OFFICE) میں موجود ہے، جس کا نمبر ۱۱۱۷ ہے، تاریخ استنساخ اول رجب سنہ ۷۲۸ھ یعنی شیخ کی وفات

۱؎ تذکرہ دولت شاہ تذکرہ امامی ہروی ۲؎ یہ تمام مضمون شیخ عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر دکن کالج پونا نے ترجمہ کرکے ہم کو عنایت کیا ہے،

کے بعد قریب ۵ سال ہے، کاتب کا نام ابوبکر بن علی بن محمد ہے جس نے شیخ کے اصلی نسخہ سے نقل لی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے "منقول من خط الشیخ العارف السعدی"۔

اس نسخہ سے شیخ کا نام شرف الدین بن مصلح الدین پایا جاتا ہے۔ اور اس میں حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) عربی قصیدہ قافیہ میم (۲) دوسرا رسالہ (۳) بوستاں جس کا نام یہاں سعدی نامہ لکھا ہوا ہے (۴) گلستاں (۵) طیبات (۶) بدائع (۷) خواتیم (۸) قصائد فارسیہ (۹) مراثی (۱۰) لمعات (۱۱) مثلثات (تین زبانوں میں عربی، فارسی اور ترکی) (۱۲) قصائد عربیہ (۱۳) ترجیعات (۱۴) مقطعات (۱۵) مجلس ہزل، ہزلیات (۱۶) مطائبات (۱۷) رباعیات (۱۸) مفردات۔

جو کتابیں کہ اس نسخہ میں داخل نہیں، وہ یہ ہیں، رسائل ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، غزلیات قدیم صاحبیہ، مضحکات،

اہل یورپ نے شیخ کے کلام کے جو حصے شائع اور ترجمے کئے، اس کا مختصر حال یہ ہے (ماخوذ از فہرست کتب قلمی فارسی موجودہ دیوان ہند مرتبۂ ڈاکٹر اتیھ (Dr. Ethe.) رسالہ دوم، پانچ مجلسوں میں سے تیسری اور چوتھی مجلسیں ایم گوئیڈان (Gueedemans) مس صاحب نے مع ترجمہ اور شرح کے شائع کیں مقام برسلا (Breslau.) ۱۸۹۰ء

بوستان نہایت نفیس اڈیشن مع شرح فارسی کے ایچ گراف .... (K. H. GRAF.) کے اہتمام سے چھپا ہے مقام ویانا (Vienna) ۱۸۵۰ء

متن مع نوٹس، مرتبۂ اے راجرس (Rodgers صاحب) بمقام لندن ۱۸۹۱ء

تراجم در زبان جرمن کارل گراف (K.H. Graff) صاحب کا ترجمہ

جینا (Jena) ۱۸۴۶ء "در زبان جرمن" شلیختا ولیسہرڈ

(Schlechta Wssehrd) ۱۸۵۲ء

تراجم در زبان جرمن رکرٹ (Rückert) صاحب کا ترجمہ لیپزک Leip

۱۸۸۲ء؛ تراجم زبان فرنچ باربیئر ڈی مینارڈ

(Garcin) گارسن ۱۸۸۰ء تراجم انگریزی، اتیچ ولبرفورس کلارک

(H. Wilberforce Clarke) صاحب کا ترجمہ بمقام لندن ۱۸۷۹ء

تراجم انگریزی جی ایس ڈیوی (G.S. Davie) صاحب کا ترجمہ بمقام

لندن ۱۸۸۲ء

منتخبات مترجمہ رابنسن (Robinson) لندن ۱۸۸۳ء

ایک ترکی ترجمہ بمقام قسطنطنیہ ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوا ہے۔

گلستان، ایڈیشن گلیاڈون (Gladwin) صاحب کی متن مع انگریزی کلکتہ ۱۸۰۶ء

۔ ایڈیشن ای۔ بی۔ ایسٹ وک (E.B. Eastwick) صاحب کی مع فرہنگ بمقام

ہرٹ فورڈ (Hertford) ۱۸۵۰ء

۔ ۔ جانسن (Johnson) کی مع فرہنگ ہرٹ فورڈ ۱۸۶۳ء

۔ ۔ جے ٹی پلاٹس (J.T. Platts) لندن ۱۸۷۴ء

تراجم در فرنچ، اندرے دوریر (Andre du Ryer) کا ترجمہ ۱۶۳۴ء

ڈالیگر (D'Alegre) کا ترجمہ ۱۷۰۴ء

گاندان (Gaundin.) کا ترجمہ ۱۷۸۹ء،

سیملٹ (Semelet.) کا ترجمہ ۱۸۵۵ء،

لاطینی جنٹیس (Gentus.) کا ترجمہ ۱۶۵۱ء، ایڈیشن دوم ۱۶۵۵ء،

تراجم در جرمن، آدم اولیاری اس (Adam Olearius.) کا بمقام شلیسوگ (Schleswig.) ۱۶۵۴ء،

تراجم در جرمن بی ڈارن (B. Darn) صاحب کا، ہابرگ ۱۸۲۲ء

" " وولف (Wolff.) کا اشٹگارٹ (Stuttgart) ۱۸۴۱ء

" " کے ایچ گراف (K.H. Graff.) کا لیپزگ ۱۸۴۶ء

تراجم در انگریزی، گلیڈون صاحب (Gladwin) کا، کلکتہ ۱۸۰۶ء لندن ۱۸۳۳ء

ڈیومولن (Dumoulin) کا ۱۸۰۶ء

جیمس راس (James Ross) کا لندن ۱۸۲۳ء، نیا ایڈیشن ۱۸۹۰ء

ای بی ایسٹوک (E.B. Eastwick) ہرٹ فرڈ ۱۸۵۲ء نیا ایڈیشن لندن ۱۸۸۰ء

جی ٹی پلاٹس (J T Platts.) کا لندن ۱۸۷۳ء

تراجم در روسی، اس، فسر نیزا ( ) کا ماسکو ۱۸۵۷ء

تراجم در پولش، آٹوفسکی (Otwinowski) کا، وارسا ۱۸۷۹ء،

تراجم در ترکی، قسطنطنیہ میں ۱۸۷۴ء، ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا اور مع شرح سودی کے تراجم ۱۲۸۶ء اور ۱۲۹۳ء میں،

عربی میں بمقام بولاق ۱۲۶۳ھ میں، ہندوستانی میں میر شیر علی افسوس کا، کلکتہ ۱۸۰۲ء جو زیر نگرانی جان گلگرسٹ صاحب ( ) کے شائع کیا گیا

طیبات کی چودہ غزلیں گراف (K. H. Graf) صاحب نے ترجمہ کرکے جرمن میں شائع کیں۔

بدائع بس " " " " " "

خواتیم کی سات غزلیں گراف (" ") " " " " "

مقالۂ فارسیہ کے انیس قصائد " " " " " "

مراثی، چند مراثی " " " " " "

رباعیات " " " " " " "

مفردات کو لاڑش (Lahuche.) صاحب نے ایڈٹ اور شائع کیا ہے۔

صاحبیہ کو باخر (Bacher) صاحب نے مع ترجمہ شائع کیا ہے اسٹراسبرگ (Strasburg.) سنہ ۱۸۷۹ء

شیخ کی شاعری | شریعت شعر کے تین پیغمبر ہیں، ان میں ایک شیخ بھی ہیں۔

در شعر سہ تن پیمبرانند ہرچند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

ہر پیغمبر جداگانہ شریعت کا پیغمبر ہے، شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے گو حافظ نے غزل کو معجزہ بنا دیا تاہم کہتے ہیں ع

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما

حضرت امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو ہوں، مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں،

تا بجائے کہ حد پارسیاں اندریں عہد دو تن گشت عیاں
زاں یکے سعدی و تانیش ہمام ہر دو را در غزل آئین تمام

لیکن اور اصناف سخن میں شیخ کی شاعری اس درجہ پر تسلیم نہیں کی گئی، امیر خسرو شیخ کی غزل گوئی کی تعریف کرکے لکھتے ہیں۔

لیک اگر سوئے دگر یازی دست ۔۔۔ شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

خود شیخ کے زمانہ میں بھی اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا اور اس کا چرچا شیخ تک بھی پہنچا، چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ شیخ اخلاق اور وعظ کے مضامین اچھے لکھ سکتے ہیں لیکن رزم کے مرد میدان نہیں،

کہ فکرش بلیغ است و رایش بلند ۔۔۔ دریں شیوۂ زہد و طامات و پند

نہ در خشت و کوپال و گرز گراں ۔۔۔ کہ ایں شیوہ ختم است بر دیگراں

شیخ کو یہ بات ناگوار گذری، ایک رزمیہ داستان لکھ کر بوستاں میں شامل کی جس میں بہت کچھ زور طبع دکھایا، نظامی کے خاص خاص مشہور مضامین اور اشعار کا جواب بھی لکھا اور ان سے بڑھا دینا چاہا، مثلاً نظامی کا شعر تھا،

کمان اژدہائے مسلسل شکنج ۔۔۔ دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

شیخ اس تشبیہ کو زیادہ صاف اور صورت نما کرتے ہیں،

چو پیدا شد ان پر خانہ ساز ۔۔۔ کمان اژدہائے دہن کردہ باز

لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ سے یہ میدان نہیں سر ہو سکا، وہ چار قدم تن کر اور اکڑ کر چلتے ہیں لیکن پھر بھی بڑھاپے کے ضعف سے تھک جاتے ہیں، رزم کا آغاز کس زور و شور سے کیا ہے،

[illegible] ۔۔۔ بہ شمشیر زن گرد جنگ آزمود

لیکن دوسرے ہی قدم میں لڑکھڑا کر گرتے ہیں،

ع چو دولت نباشد تہور چہ سود،

بااینہمہ چونکہ شیخ کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے، ہم اس رزمیہ کے چند اشعار نقل کرتے ہیں،

بہاندم کہ دیدم گرد سپاہ	زرہ جامہ کردیم و مغفر کلاہ
بچو اسپ تازی برانگیختیم	چو باراں بلالک فرو ریختیم
دو لشکر بہم برزدند از کمیں	تو گفتی زدند آسماں بر زمیں
ز باریدن تیر ہمچوں تگرگ	بہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ
بہ صید ہژبرانِ پرخاش ساز	کنند اژدہائے دہن کردہ باز
زمیں آسماں شد ز گرد کبود	چو انجم درو برق و شمشیر و خود

غرض نہ ان کا یہ دعویٰ مسلّم ہے کہ وہ رزم میں فردوسی اور نظامی کے دوش بدوش چل سکتے ہیں، نہ امیر خسرو وغیرہ کی یہ رائے صحیح ہے کہ وہ غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتے، قصائد اور مثنوی میں ان کی بلند پایگی سے کون انکار کر سکتا ہے،

ایران میں شاعری کو تین سو برس گذر چکے تھے، لیکن شاعری اب تک اصلی جادہ پر نہیں آئی تھی، شاعری کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہو، اور وہ اس جذبہ کو اسی جوش و خروش سے ادا کرے، جس جوش سے وہ پیدا ہوا تھا، فردوسی، نظامی، فرخی، انوری کے کمال شاعری میں کس کو کلام ہے، لیکن ان میں سے اپنے دل کے جذبات کس نے لکھے ؟ فردوسی قدرتی شاعر ہے، اس لیے وہ غیروں کے جذبات بھی اس طرح ادا کرتا ہے کہ گویا خود اس کے دل سے اٹھے ہیں، عرب کی تحقیر اور طعن کے وقت وہ خود یزدگرد بن جاتا ہے، سہراب کی ماں کا نوحہ اس درد سے لکھا ہے کہ گویا اس کو سہراب

کی ماں کی زبان ہاتھ آگئی ہے، لیکن فرض کر دیہ واقعات خود فردوسی پر پیش آتے توکیا ان شعلوں کی شرر فشانی اور نہ بڑھ جاتی، مدحیہ قصائد تو بالکل ہی تصنع اور آورد تھی، غزل بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی، عشق و محبت کے جذبات اس میں ادا نہیں کئے جاتے تھے بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت و قدرت، جود و سخا، تلوار اور گھوڑے کی مدح کرتے تھے، غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا کے اوصاف بیان کرتے تھے،

شیخ پہلا شخص ہے جس نے شاعری کا صحیح استعمال کیا، تفصیل اس کی حسب ذیل ہے،

(۱) سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے آزادی ہے، عرب کی شاعری کی اصلی روح یہی تھی، جو عجم میں آکر گم ہو گئی تھی، عرب کے شعرا سلاطین اور امرا کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے۔ متنبی سیف الدولہ کی مدح لکھ کر لے جاتا ہے اور ساتھ ہی نہایت گستاخی اور بیباکی سے اس کو صلوٰتیں سناتا جاتا ہے، فردوسی نے بھی محمود کی جاں خروش ہجو لکھی، لیکن رو در رو نہیں بلکہ چوری سے، پھر تمام عمر بھاگتا پھرا، شیخ کو کئی درباروں سے تعلق رہا، ابوبکر سعد زنگی اس کا خاص ممدوح اور آقا تھا، انکیانو جو خاندان اتابک کے بعد ہلاکو خاں کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا، اس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا، ان سب کے مقابلہ میں اس نے اپنی آزادی قائم رکھی، ابوبکر نے ہلاکو خاں کی اطاعت قبول کر لی تھی، یہاں تک کہ جب ہلاکو خاں نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد کو فوج دیکر اعانت کے لیے بھیجا، اور جب بغداد تاراج ہوا، تو ابوبکر نے مبارکباد کے لیے سفارت بھیجی، بایں ہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم کے قتل کا مرثیہ لکھا اور

اس قدر پراثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے، یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خان کا ساتھ دیا، شیخ نے اس مرثیہ میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی،

خسرو صاحبقران غوث زمان ابوبکر سعد   آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست دادش گزیں
مصلحت بود اختیار رای روشن بین او   زیر دستان را سخن گفتن نشاید جز چنیں

یعنی ابوبکر نے جو ہلاکو خان کی مدد کی تو اس میں کچھ مصلحت ہوگی۔

اتابکوں کی مدح میں شیخ کے متعدد قصیدے ہیں، لیکن ہر قصیدہ میں نہایت دلیری سے نصیحت کی ہے اور صاف کہدیا ہے کہ جسکو دربار کی طمع نہیں وہ بیاک کے سوا نہیں رہ سکتا،

سعدیا چنداں کہ میدانی بگو   حق نباید گفتن الّا آشکار
ہر کرا خوف و طمع دربار نیست   از خطا باکش نباشد وز تتار
خسرو عادل امیر نامور   اتابک تو خسرو عالی تبار

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

حرامش باد ملک پادشاہی   کہ پیشش مدح گویند از تقادم
جہاں سالار عادل اتابک تو   سپہدار عراق و ترک و دیلم
چنیں پند از پدر نشنیدہ باشی   الا گر ہوشیاری بشنو از عم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ   سخن ملکے است سعدی را مسلم

بوستان میں لکھتے ہیں،

دلیر آمدی سعدیا در سخن   چو تیغت بدست است فتحے بکن
بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ   نہ رشوت ستانی و نہ رشوہ دہ

طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگوے — طمع بند و دفتر ز حکمت بشوے

اس زمانہ میں شاعری کا بڑا حصہ مدح تھی اور شعرا اسی کے ذریعہ سے گذر کرتے تھے، شاعری کی بڑی اصلاح یہ تھی کہ شاعری کے چہرہ سے یہ داغ مٹا دیا جائے، شیخ نے یہ فرض نہایت نفس کشی کے ساتھ ادا کیا وہ تنگ حال اور مفلس تھا، لوگ اس کو ترغیب دیتے تھے مدحیہ قصائد لکھو تو اچھی طرح بسر ہوگی، وہ جواب دیتا تھا کہ آزاد گردن کسی کے آگے جھک نہیں سکتی۔

گویند سعدیا بچہ بطال ماندۂ — سختی مبر کہ وجہ کفافت معین است

یکچند اگر مدیح کنی کامراں شوی — صاحب ہنر کہ مال ندارد تغابن است

بی زر میسرت نشود کام دوستاں — چوں کام دوستاں ندہی کام دشمن است

آرے مثل بہ کرگس مردار خور دہند — سیمرغ را کہ قاف قناعت نشیمن است

از من نیاید این کہ بدہقان و کدخدا — حاجت برم کہ فعل گدایان خرمن است

عرب میں مدح کے یہ معنی تھے کہ شاعر جس شخص کا ممنون ہوتا تھا یا جو شخص قوم میں قابل مدح کام کرتا تھا، شاعر اس کا اظہار کرتا تھا لیکن صلہ اور انعام سے اسکو کچھ واسطہ نہ ہوتا تھا،

زہیر بن ابی سلمیٰ جب ہرم بن سنان کے دربار میں گیا، اور ہرم کو سلام کیا تو ہرم نے حکم دیا کہ زہیر جب دربار میں آئے اور سلام کرے تو اس کو صلہ دیا جائے، اس کے بعد سے زہیر کا معمول ہوگیا کہ جب دربار میں جاتا تو کہتا کہ تمام مجمع کو سلام کرتا ہوں لیکن ہرم کو نہیں، عرب میں سب سے پہلے جس شاعر نے قصیدہ پر صلہ لیا وہ نابغہ ذبیانی تھا، عرب نے اس کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔

شیخ نے مدحیہ قصائد کو عرب کے قدیم انداز پر لانا چاہا، اس نے سلاطین و امراء کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن ان کے صحیح اوصاف بیان کرتا ہے، اور مبالغہ آمیز خیالات جو مدحیہ قصائد کے عنصر میں داخل ہو گئے تھے ان کو لغو بتاتا ہے، مثلاً قصیدہ کے خاتمہ میں ممدوح کو یوں دعا دیتے تھے کہ لاکھوں کروڑوں برس زندہ رہے، یہاں تک کہ مرزا غالب نے قصہ ہی فیصل کر دیا، ع تا خدا باشد بپاینده باد

شیخ ہزار برس کی دعا دینے پر بھی راضی نہیں،

ہزار سال نگویم بقائے عمر تو باد   کہ این مبالغہ دانم ز عقل نشماری
ہمیں سعادت توفیق بر مزیت باد   کہ حق گزاری و ناحق کسے نیازاری
نہ کاہد انچہ نوشتہ است عمر و نفزاید   پس اینچہ فائدہ گفتن کہ تا بحشر بپائی

ممدوح کو عموماً ابر گہر فشاں اور دریائے بیکراں کہا کرتے ہیں، شیخ کہتا ہے،

نہ گویمت چو زبان آوران رنگ آمیز   کہ ابر مشک فشانی و بحر گوہر زا

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

من این غلط نہ پسندم برای رونق خویش   کہ دست و طبع تو گویم بہ بحر و کان ماند

یہ انوری کے اس شعر پر تعریض ہے،

گر دل و دست بحر و کان باشد   دل و دست خدایگان باشد

مجد الدین رومی کی مدح میں کہتے ہیں،

نگویمت بہ تکلف فلان دولت و دین   سپہر مجد و معالی جہان دانش و داد

خواجہ شمس الدین محمد اور علاء الدین کا تمام دنیائے اسلام پر احسان تھا، تاتاریوں کے آشوب ناک زمانہ میں اسلام کی جو کچھ حالت قائم رہ گئی، وہ انہی صاحبوں کی

یہ دولت تھی اس لیے شیخ ان دونوں بھائیوں کی مدح نہایت اخلاص سے کرتا ہے لیکن بالکل اسی طرح جس طرح آج کسی گورنر یا حاکم صوبہ کو سپاسنامہ پیش کیا جاتا ہے، مثلاً خواجہ علاء الدین کی مدح میں کہتا ہے،

خدای خواست کہ اسلام در حمایت او ز شیر حادثہ در بارۂ اماں ماند

دگرنہ فتنہ چناں کردہ بود دنداں تیز کزیں دیار نہ مرغ و نہ آشیاں ماند

تو آں جواد زمانی کہ از دحام زماں درت بہ مشرب شیریں کارواں ماند

جذبات (۲) شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا، وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں اس لیے وہ اسی وقت شعر کہتا ہے، جب اُس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے، غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی، شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کیے جن لوگوں کا اس نے مرثیہ لکھا وہ لوگ تھے جن کے مرنے سے اسکو سخت صدمہ پہنچا تھا، اخلاقی مضامین بھی وہ اسی وقت ادا کرتا ہے، جب کسی موثر واقعہ کے پیش آجانے سے خود اسکے دل پر سخت اثر پڑتا ہے،

تنم می بلرزد چو یاد آورم مناجات شوریدۂ در حرم

بہ حکم دو تہ بر بندۂ دل بسوخت کہ می گفت و فریاد اش می فروخت

مرا شبہہ در دل آمد بریں کہ پاک است و خرم بہشت بریں

وراں جائے پاکان امید دار گِل آلودۂ معصیت را چہ کار

—— امرا میں سے اسکو سب سے زیادہ محمد بن ابی بکر بن سعد زنگی سے محبت تھی، وہ نہایت ہنرور اور شوکت و شان کا شہزادہ تھا، وہ سفر میں تھا کہ باپ کے مرض الموت

کی خبر سنی اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں شیراز کو روانہ ہوا، لیکن راہ میں قضا کر گیا، چونکہ وہ ولیعہد تھا، سب لوگ منتظر تھے کہ وہ آکر تخت و تاج کا مالک ہوگا، اس بنا پر اس کے مرنے کا عام ماتم ہوا، شیخ کو بھی سخت صدمہ ہوا، اسی حالت میں مرثیہ لکھا، جس کے ہر شعر سے خون جگر کی بو آتی ہے،

بزرگان چشم و دل در انتظارند عزیزان وقت و ساعت می‌شمارند
غلامان در و گوہر می‌فشانند کنیزان دست و ساعد می‌نگارند
ملک‌زادان سیاق و بدرہ زرہا بہ رہواران تازی بر سوارند
کہ شاہنشاہ عادل سعد بوبکر بہ ایوان شہنشاہی در آرند
حرم شادی کنان بر طاق و ایوان کہ مروارید بر تاجش ببارند
امید تاج و تخت خسروی بود ازین غافل کہ تابوتش در آرند
چہ شد پاکیزہ رویان حرم را کہ بر سر کاہ و بر زلف غبارند
ہمی دانم حدیث نامہ چون است ہمی دانم کہ عنوانش بہ خون است

(۳) اس وقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے، قومی یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا، شیخ پہلا شخص ہے جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا، عباسیوں کی سلطنت گو اب برائے نام رہ گئی تھی، پھر بھی پانچسو برس کی اسلامی یادگار تھی، اور بغداد تمام اسلامی دنیا کا مرکز تھا، اس لیے اس کا مٹنا قوم کا مٹنا تھا، شیخ نے اس بنا پر خلیفہ اور بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا اور جس دل سے لکھا اس کا اندازہ ان اشعار سے خود کر سکتے ہیں

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین[۱]

۱؎ دیکھو مستعصم کے مرنے کا رنج نہیں کرتا بلکہ ملک کے زوال کا رنج کرتا ہے اور انہی باتوں کا ذکر کرتا ہے جن سے عام قوم کو تعلق ہے۔

اے محمد اگر قیامت سر بروں آری ز خاک　　سر بروں آر و قیامت در میانِ خلق بیں

نازنینانِ حرم را موجِ خون بے دریغ　　ز آستان بگذشت، ما را خونِ دل از آستین

دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکتِ بیت الحرام　　قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقاں بر زمیں

خونِ فرزندانِ عمِ مصطفیٰ شد ریختہ　　ہم بر آں جائے کہ سلطاناں نہادندی جبیں

باش تا فردا کہ بینی روزِ داور ستخیز　　کز لحد با زخمِ خوں آلودہ برخیزد دفیں

ان اجمالی اور سرسری خصوصیات کے بعد ہم ان انواعِ شاعری سے مفصل بحث کرتے ہیں جن کو شیخ نے ترقی دی یا اس کا رنگ بدل دیا،

اخلاقی شاعری

(۴) اخلاقی شاعری شیخ سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، حکیم سنائی، خیام، اوحدی، عطار نے اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا تھا، تاہم شیخ نے اس آسمان کو اور بلند کر دیا، اخلاقی شاعری پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے،

(۱) کس قسم کے اخلاق کی تعلیم کی اور ان میں کس حد تک فلسفیت اور نکتہ سنجی پائی جاتی ہے

(۲) فلسفۂ اخلاق کو کس طرح شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا، یہ دیکھنا چاہیے کہ اخلاقی مسائل اگرچہ محض سادہ طریقہ پر نظم میں ادا کر دیے جائیں تو وہ فلسفہ ہوگا، شاعری نہ ہوگی،

شیخ نے اخلاقی عنوان جو اختیار کیے وہ حسبِ ذیل ہیں،

عدل و تدبیر، احسانِ عام، عشق و محبت، تواضع، رضا بالقضا، قناعت، تربیت، شکر، توبہ، مناجات،

عدل و تدبیر اصل میں پالٹیکس اور سیاست سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن چونکہ ان کو اخلاق سے نہایت قوی تعلق ہے، شیخ نے اس کو بھی اخلاق میں شامل کر لیا، ایشیائی ملکوں میں سلطنت کی بنیاد بادشاہ پر قائم ہوتی ہے، اور وہ حاکم علی الاطلاق کہا جاتا ہے،

اگر وہ عدل، انصاف کرے تو اس کی عنایت ہے، اور نہ کرے تو اس کو کوئی ٹوک نہیں سکتا،

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

لیکن شیخ نے مختلف حکایتوں کے پیرایہ میں بتایا کہ ہر شخص کو نہایت آزادی کیساتھ بادشاہ پر نکتہ چینی کا حق ہے، شیخ نے آزادانہ اعتراض کو جس پیرایہ میں ادا کیا، آزادی بیباکی اور جانبازی کی اس سے بڑھکر تعلیم نہیں ہوسکتی،

ایک ظالم بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ دگوں کے جانور زبردستی پکڑ کر ان سے کام لیتا تھا، اتفاق سے ایک دن شکار کے پیچھے فوج کا ساتھ چھوٹ گیا، اور ایک گاؤں میں رات بسر کرنی پڑی، ایک شخص نے دیکھا کہ اپنے گدھے کو اس طرح مار رہا ہے کہ اسکے ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے ہیں، بادشاہ نے روکا، اس نے کہا میں اسلئے اسکو بیکار کیے دیتا ہوں کہ ہمارے ملک کا بادشاہ بیگار میں نہ پکڑے، یہ کہکر بادشاہ کو خوب برا بھلا کہا، صبح کو اہل فوج ڈھونڈتے ڈھونڈتے گاؤں میں پہنچے، اور بادشاہ تخت گاہ میں واپس آیا، یہاں پہونچکر اس نے اس شخص کو پکڑ بلایا اور رات کی گستاخی کی سزا دینی چاہی، اس نے کہا،

نہ تنہا منت گفتم اے شہریار
کہ برگشتہ بختی و بد روزگار

چرا خشم بر من گرفتی و بس
منت پیش گفتم ہمہ خلق پس

یعنی مجھ ہی پر کیوں غصہ ہے، تجکو تو سب برا کہتے ہیں، فرق یہ ہے کہ لوگ پیچھے برا کہتے ہیں، میں نے سامنے کہا،

چو بیداد کردی توقع مدار
کہ نامت بہ نیکی رود در دیار

تراچارہ از ظلم برگشتن است ۔ نہ بیچارۂ بے گنہ کشتن است

یعنی تجھ کو یہ مناسب ہے کہ ظلم سے باز آئے یہ نہیں کہ ایک بیگناہ کو قتل کرے،

زنا مہربانی کہ در دہ ایست ۔ ہمہ عالم آواز ۂ جور تست

عجب گر منت بر دل آمد درشت ۔ بکشش گر توانی ہمہ خلق کشت

بداں کے ستودہ شود بادشاہ ۔ کہ خلقش ستایند در بارگاہ

چہ سود آفریں بر سر انجمن ۔ پس پردہ نفریں کناں مرد و زن

ہمی گفت و شمشیر بالاے سر ۔ سپر کردہ جاں پیش تیر قدر

ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش کی حق گوئی سے بادشاہ ناراض ہوا، اور اسکو قید کر دیا، اس کے دوستوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کے سامنے یہ آزادی خلاف مصلحت تھی، درویش نے جواب دیا،

رسانیدنِ امرِ حق طاعت است ۔ زِ زنداں نہ ترسم کہ یک ساعت است

کسی نے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی، بولا کہ یہ اس کی حماقت ہے، ایک ساعت نہیں، تمام عمر اس کو قید خانہ میں رہنا ہوگا، درویش نے کہا،

کہ دنیا ہمی ساعتے بیش نیست ۔ غم و خورمی پیش درویش نیست

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے، درویش نے کہا مجھکو اس کی پرواہ بھی نہیں، مجھکو جس سے کہنا سننا ہے وہ بولے بغیر میری بات سمجھ سکتا ہے

من از بیزبانی ندارم غمے ۔ کہ دانم کہ ناگفتہ داند ہمے

اس قسم کی متعدد حکایتیں ہیں جو نہایت پُر اثر طریقہ سے لکھی ہیں جن سے اس نے اپنے تمام ابنائے زمانہ کے خلاف لوگوں کو آزادی اور بیباکانہ حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور

جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ کا یہ قول نہ تھا، بلکہ عمل بھی تھا تو اس کی تعلیم کا دل پر نہایت قوی اثر ہوتا ہے، شیخ نے یہ بھی بتایا کہ ملک کی آمدنی میں بادشاہ کا صرف اس قدر حق ہے کہ بقدر ضرورت اس سے تمتع اٹھائے، اس سے زیادہ اس کو کوئی حق نہیں، ایک سادہ وضع بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے اس سے کہا کہ حضور دیبائے چینی کی قبا زیبِ تن فرماتے تو زیادہ موزوں تھا، بادشاہ نے کہا،

نہ از بہرِ آں می ستانم خراج		کہ زینت کنم بر خود و تخت و تاج
مرا ہم ز صد گونہ آز و ہواست		ولیکن نہ تنہا خزینہ مراست
خزائن پُر از بہرِ لشکر بود		نہ از بہر آئین و زیور بود
چو دشمن خرِ روستائی برد		ملک باج و دہ یک[۱] چرا می خورد

یہ خود شیخ کے خیالات ہیں لیکن بلاغت کے اصول کے لحاظ سے بادشاہ کی زبان سے ادا کیا ہے کہ بادشاہوں پر اس کا اثر زیادہ ہوگا،

احسان عام | احسان کا مضمون ایشیا کا مرغوب عام مضمون ہے، اور شیخ نے اس مضمون اسی عام طریقہ پر لکھا ہے جو ایشیائی طبائع کا عام انداز ہے، حاتم طائی کی فیاضیاں کی چھوٹی حکایتیں بڑی آب و تاب سے لکھی ہیں اور یہ نہ سمجھے،

بیا بہ ملکِ قناعت کہ در سر نہ کشی		ز نفسہا کہ بہمت فروش طے بستند

یہ بھی ہدایت کی ہے کہ مستحق اور غیر مستحق کی تمیز کی کوئی ضرورت نہیں،

کرہ بر سرِ بندا احسان مزن		کہ ایں مکر و شبیداست، آں زرق و فن

اخیر میں بڑا دل کر کے یہ تفریق کی ہے کہ ظالموں کے ساتھ احسان نہ کرنا چاہیے، تاہم اس

---

[۱] وہ محصول جس کو عربی میں عشر کہتے ہیں یعنی آمدنی کا دسواں حصہ،

باب میں بھی شیخ نے بعض نکتے اپنے زمانہ کی عام سطح سے بالاتر لکھے ہیں، مثلاً دینداروں کے نزدیک محاسنِ اخلاق جس قدر ہیں، مثلاً عفو، حلم، مروت، جود وکرم سب مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر مذہب والوں کے ساتھ عموماً اشداء علی الکفار کا برتاؤ کرنا چاہیے، لیکن شیخ کے احسان عام کا بادل، ویرانہ وچمن دونوں پر یکساں برستا رہا ہے، اس نے ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر کو مومن سمجھ کر مہمان کیا، جب اس کا گبر ہونا ظاہر ہوا تو دسترخوان پر سے اٹھا دیا، اس پر وحی آئی کہ

منش دادہ صد سال روزی و جاں ترا نفرت آمد ازو یک زماں

یعنی میں نے تو اس کو سو برس تک کھلایا پلایا، تم دم بھر بھی اس کے ساتھ لبسر نہ کرسکے، عشق شیخ کے زمانہ میں مسلمانوں کی توتوں میں یک لخت زوال آچکا تھا، اس لیے عشق ومحبت کے سوا اور کیا کام باقی رہا تھا، شیخ نے عام مذاق کے لحاظ سے اس راگ کا چھیڑنا بھی ضروری سمجھا اور اپنی دانست میں اس میں بھی اصلاح کی یعنی عشق مجازی کو برا کہا اور عشق حقیقی کے محاسن بیان کیے لیکن سچ یہ ہے کہ اگر ایک اخلاقی کتاب سرے سے اس فتنہ انگیز مضمون سے پاک رہتی تو بہت اچھا ہوتا، ع

اہلِ زکام را دہ ایں گل کہ بو کند

قناعت، تواضع، اور رضا وغیرہ کو جادو اثر طریقہ سے بیان کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین کے بار بار اعادہ کرنے سے قوم میں افسردگی، بیکاری، پست ہمتی پیدا ہوتی ہے، اس لیے یہ مضامین ہمارے اخلاقی دفتر سے چند روز کے لیے نکال دینے کے قابل ہیں،

قناعت بظاہر پست ہمتی کا دوسرا نام ہے، اور اس میں شک نہیں کہ قناعت کے جو غلط معنی عموماً علماء اور زہاد نے دلوں میں بٹھا دیے ہیں، اس نے قوم کے اپاہج بنانے میں بہت مدد دی ہے، لیکن اتفاق یہ ہے کہ شیخ نے قناعت کے جو معنی قرار دیے وہ انسان کی خودداری اور عزتِ نفس کا سب سے ضروری مرحلہ ہے، ایشیائی حکومتوں میں ہر قسم کے بیہودہ اخلاق مثلاً خوشامد، ذلتِ نفس، نفاق، ریا، زمانہ سازی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ان باتوں کے بغیر کوئی شخص دولت اور عزت نہیں حاصل کر سکتا، اسلئے دولت وعزت کی پروا نہ کرنا، ان عیوب سے بچنے کا سب سے پہلا مرحلہ ہے، شیخ اسی بنا پر قناعت کی تعلیم دیتا ہے،

قناعت کن اے نفس بر اندکے — کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیشِ سلطاں بخواہش روی — چو یکسو نہادی طمع خسروی
وگر خود پرستی شکم طبلہ کن — در خانۂ این و آں قبلہ کن
قناعت سرافرازد اے مرد ہوش — سر پر طمع بر نیاید ز دوش
کسے را کہ درج طمع در نوشت — نباید بہ کس عبد و چاکر نوشت
کند مرد را نفسِ امارہ خوار — اگر ہوشمندی، عزیزش مدار
گر آزادۂ بر زمیں خسپ و بس — مکن بہر قالیں زمیں بوس کس
چو بینی کہ از سعی بازد خورم — بہ از میدہ بر خوانِ اہلِ کرم

یعنی اگر تم قناعت اختیار کرو گے تو تم کو بادشاہ اور فقیر یکساں نظر آئیں گے تم بادشاہ کے آگے کیوں سر جھکاتے ہو، طمع چھوڑ دو، تم خود بادشاہ ہو، جو شخص طمع چھوڑ دے گا وہ اپنے آپ کو غلام اور خانہ زاد نہیں لکھ سکتا، نفسِ امارہ انسان کو ذلیل

کرتا ہے، اگر تم کو عقل ہے تو تم نفس کی عزت کرو، تم کو زمین پر پڑ کر سو رہنا چاہیے، لیکن قالین کے لیے کسی کے آگے زمین نہیں چومنی چاہیے، اس سے بڑھکر کیا شریفانہ تعلیم ہو سکتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اگر عزتِ نفس کے قائم رہنے کے ساتھ دولت و ثروت نام و نمود، جاہ و اعزاز حاصل ہو سکتا ہو تو شیخ اس سے باز رکھنے کی تعلیم نہیں دیتا،

ایک حکایت میں شیخ نے اس نکتہ کو صاف اور واضح کر دیا ہے، اور بتایا ہے کہ کسب اور جہد کو توکل پر ترجیح ہے، حکایت یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک لومڑی کو دیکھا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس کو تعجب ہوا کہ یہ کھاتی پیتی کہاں سے ہے؟ اتفاق سے ایک شیر آنکلا، اسکے منھ میں شکار تھا، جب وہ کھا کر چلا گیا تو لومڑی نے اس کا بچا ہوا حصہ کھا لیا، یہ دیکھکر اس شخص کو خیال ہوا کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں، میں بھی اسی طرح پا شکستہ بن کر بیٹھ رہوں، خدا کہیں سے روزی بھیج دیگا، لیکن کئی دن گذر گئے، یونہی فاقے کیا کیے، آخر ہاتفِ غیب نے پکارا،

برو شیر غرندہ باش اے دغل	مینداز خود را چو روباہ شل

یعنی شیر ہو کر لومڑی کیوں بنتے ہو،

بہ چنگ آر و با دیگراں نوش کن	نہ بر فضلہ دیگراں گوش کن
چو مرداں بہ بُرّن رنج و راحت رساں	مخنث خورد دست رنج کساں
بگیر اے جواں دستِ درویش پیر	نہ خود را بیفگن کہ دستم بگیر

تربیت — تربیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور بہت سے نکتے ایسے لکھے ہیں، جو اس زمانہ کی سطح سے بالاتر ہیں، مثلاً قدیم تربیت میں لڑکوں کو زجر و توبیخ بلکہ جسمانی سزا دینی ایک ضروری چیز تھی، اور آج تک وہ خیال قائم ہے، خود شیخ نے ایک معلم کی زبان سے کہا ہے

جو را ستاد به ز مهر پدر

لیکن شیخ کی خود تعلیم یہ ہے،

نوآموز را ذکر و تحسین و زہ | ز توبیخ و تہدید استاد بہ

صنعت و حرفت کی تعلیم، امرا (شرفا) کے بچوں کے لیے بھی لازمی قرار دی ہے، حالانکہ آج یورپ کی مثالیں دیکھ کر بھی ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے،

بیاموز پرورده را دست رنج | وگر دست داری چو قارون بگنج
(صنعت)
بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر | نگردد تہی کیسۂ پیشہ ور
چہ دانی کہ گردیدنِ روزگار | بہ غربت بگرداندش در دیار
چو بر پیشہ باشدش دسترس | کجا دست حاجت برد پیش کس

عام خیال یہ ہے کہ بچوں کو کم درجہ کی خوراک اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنانا چاہیے، تاکہ آرام طلب اور عیش پسند نہ ہو جائیں، لیکن شیخ فرماتے ہیں،

پسر را نکو دار و راحت رساں | کہ چشمش نماند بہ دستِ کساں

یعنی بچے کو سیر و ساماں سے رکھنا چاہیے تاکہ اس میں بلند نظری پیدا ہو اور لوگوں کی طرف اس کی نگاہیں حسرت سے نہ اٹھیں،

اُس زمانہ میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا، صوفیہ اور اہلِ نظر اس کو عشقِ حقیقی کی منزلِ اولیں قرار دیتے تھے، اور اربابِ ذوق کے لیے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی ساماں نہ تھا، شیخ چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا، اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا، اس لیے اس نے نہایت سختی سے اس کی برائیاں بیان کیں،

سراز مغز و دست از درم کن تہی | چو خاطر بہ فرزند مردم نہی

مکن بد به فرزند مردم نگاه | که فرزند خویشت بر آید بشاہ

صوفیہ کا پردہ کھولتے ہیں

گزد ہے نشنید با خویش پسر | کہ ماپاک بازیم واہلِ نظر
زمن پرس فرسودۂ روزگار | کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار
ازاں برگِ خرما خورد گوسفند | کہ قفل است بر تنگ خرما و بند

صوفیوں کے اس دعویٰ کو کہ جمال سے ہم کو صنعتِ ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے، اس طرح رد کرتے ہیں،

چو طفل یک روزہ ہوشش نبرد | کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خرد
محقق ہماں بیند اندر ابل | کہ در خوبرویانِ چین و چگل

یعنی اگر صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو وہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے، خوش جمال اور پری جمال کی کیا تخصیص ہے، ایک باریک بیں کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں، جو چین اور چگل کے معشوقوں میں پاتا ہے،

شیخ حسن پرستی سے منع نہیں کرتا لیکن بتاتا ہے کہ اس کا صحیح مصرف کیا ہے،

زنِ خوب و خوشخوے آراستہ | چہ ماند بہ نادانِ نوساختہ (امرد)
در ودم چو غنچہ دمے از وفا | کہ از خندہ افتد چوں گل بر قفا
خرابت کند شاہد خانہ کن | برو خانہ آباد گرداں بہ زن

افسوس ہے کہ عورتوں کا رتبہ شیخ کے زمانہ میں مردوں سے بہت کم سمجھا جاتا تھا، اسلئے جو لوگ اپنی بیوی سے زیادہ محبت رکھتے تھے زن پرست کہلاتے تھے، اور لوگ ان کو

طعنہ دیتے تھے،

شیخ نے اگرچہ ان لوگوں کی طرف سے یہ معذرت کی ہے،

کسے را کہ بینی گرفتار زن / مکن سعدیا طعنہ بر وی مزن
تو ہم جور بینی و بارش کشی / اگر یک شبے در کنارش کشی
زنان شوخ و فرماندہ و سرکش اند / ولیکن بدینم کہ در بر خوش اند

لیکن افسوس ہے کہ اس ذوقی پیکر کا غرض و غایت لوگوں نے صرف نفس پرستی سمجھی، یہ نہ سمجھے کہ یہ جنس لطیف چہرۂ کائنات کا آب و رنگ ہے،

شیخ نے عورتوں کے متعلق ایک اور روایت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا معیار اخلاق کس قدر پست ہو گیا ہے،

زن نو کن اے دوست در ہر بہار / کہ تقویم پارینہ ناید بکار

لیکن اگر عورت بھی اس فلسفہ پر عمل کرے تو کیا جواب ہوگا؟

شیخ ہمہ تن مذہبی آدمی تھا، اس لیے اس نے تعلیم و اخلاق کی بنیاد بھی مذہب پر رکھی ہے، مذہبی غلو میں حقیقت شناسی بہت کم قائم رہتی ہے، فرض کرو ایک شہر میں ہزار دس مسجدیں ہیں اور نمازیوں کی ضرورت سے زیادہ ہیں، باوجود اس کے ایک شخص پھر نئی مسجد بنائے تو مذہبی آدمی کبھی اس کام کو عبث اور بے فائدہ نہیں کہہ سکتا، حالانکہ قرون اولیٰ میں ایسے کام سے علانیہ روک دیا جاتا تھا، حضرت عمرؓ نے حکم بھیج دیا تھا کہ کسی شہر میں (بجز کوفہ و بصرہ) کے ایک سے زیادہ مسجد نہ بننے پائے، ولید نے جامع مسجد کی تعمیر میں شاہانہ حوصلہ مندی کی تو قوم نے علانیہ کہہ دیا کہ بیت المال کا روپیہ اس طرح ضائع نہیں کیا جا سکتا،

فرض کرو ایک شہر میں بہت سی مسجدیں موجود ہیں۔ لیکن انگریزی تعلیم (جو تحصیل معاش کا ذریعہ ہے) اس کا سامان بالکل نہ ہو، اب ایک شخص ایک مسجد اور دوسرا شخص انگریزی مدرسہ بنائے تو تم کس کام کو ترجیح دو گے

شیخ کی نکتہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے جب نظر آتا ہے کہ وہ مذہبی جوش اور غلو کے ساتھ حقیقت شناسی سے کبھی الگ نہیں ہوتا، ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بادشاہ نے روزہ رکھا، باورچی کی بیوی نے کہا سلطان کو اس روزہ سے کیا ثواب ہوگا کہ ہم سب بھوکے مریں گے۔

که سلطان ازین روزه گوئی چه خواست　　که افطار او عید طفلان ماست

شیخ اس مسئلہ کو زیادہ روشن کرنے کے لیے خود اپنی زبان سے کہتا ہے،

خورنده که خیرش بر آید ز دست　　به از صائم الدهر (روزہ دار) دنیا پرست
مسلم کسی را بود روزه داشت　　که درمانده را دهد نان چاشت
دگر نه چه حاجت که زحمت بری　　نه خود بازداری و هم خود خوری
خیالات نادان خلوت نشین　　بهم بر کند عاقبت کفر و دین

پھر شعر میں کہتا ہے کہ سادہ دل خلوت نشین مذہب کو خراب کر دیتا ہے۔

ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش نے حج کا سفر کیا اور ہر ہر قدم پر دو رکعتیں نماز پڑھتا جاتا تھا، اس ریاضت شاقہ پر اس کے دل میں غرور پیدا ہوا، ہاتف غیب نے آواز دی کہ ایک دل کو خوش کرنا ہزار رکعت سے بہتر ہے۔

به احسانی آسوده کردن دلے　　به از الف رکعت به هر منزلے

ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے، لیکن صوفیہ کا گروہ کثیر جو ہمہ تن ریاکار ہے

ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کر سکتا، شیخ اس راز سے خوب واقف تھا اس لیے اس نے نہایت دلیری سے اس طلسم کو توڑا، غزلوں میں نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے،

برون نمیرود از خانقہ یکے ہشیار　　　کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیان مستند

محتسب در قفاے رندان است　　　غافل از صوفیانِ شاہد باز

بوستان میں ایک شخص کی زبان سے ان لوگوں کی پوری تصویر کھینچی ہے،

کہ زنہار ازیں مردمانِ خموش　　　پلنگانِ درندہ صوف پوش

کہ چون گربہ زانو بہم بر زنند　　　وگر صیدے افتد چو سگ در جہند

سوئے مسجد آوردہ دکانِ شید　　　کہ در خانہ کمتر تواں یافت صید

سپید و سیہ پارہ بر دوختہ　　　بہ سالوس پنہاں زر اندوختہ

زہے جو فروشانِ گندم نمائے　　　جہاں گرد سالوس و خرمن گدائے

مبیں در عبادت کہ پیرند و سست　　　کہ در رقص و حالت جوانند و چست

عصای کلیم اند بسیار خوار　　　بہ ظاہر چنیں زرد روے و نزار

ز سنت نہ بینی در ایشاں اثر　　　بجز خواب پیشین و نان سحر

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شیخ نے اخلاق کی بنیاد بے تعصبی پر قائم کی، اس نے مختلف طریقوں سے بے تعصبی کی تعلیم دی ہے، اور بتایا ہے کہ تعصب کے ساتھ اخلاق کا لطیف اور نازک حاسہ قائم نہیں رہ سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر سے جو برتاؤ کیا تھا، اُس کی نسبت وحی کے ذریعہ سے ان کو خدا نے تنبیہ کی ہمارا یہ طریقہ نہیں، اس حکایت سے شیخ کو یہ جتانا تھا کہ معاشرت اور حسن اخلاق میں کافر و مسلم کی تمیز

نہیں، شیخ عموماً ہر مذہب وملت کے بڑے لوگوں کا نام جب لیتا ہے تو ادب سے لیتا ہے، دارا آتش پرست تھا، تاہم شیخ کہتا ہے،

شنیدم کہ دارائے فرخ تبار ز لشکر جدا ماند روز شکار

نوشیرواں (جس کے زمانہ میں پیدا ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناز کرنا ثابت کیا جاتا ہے)

سزد گر بدورش بنازم چناں کہ سید بہ دوران نوشیرواں

خود سنی اور پکا سنی تھا (علی رغم الف قاضی نور اللہ) لیکن فردوسی کا نام (جو قطعاً شیعہ تھا) اس طرح لیتا ہے،

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد کہ رحمت برآں تربت پاکش باد

کیا آج کوئی روشن خیال سنی عالم کسی شیعہ کی تربت کو پاک اور اس کی نسبت رحمت کی دعا کر سکتا ہے،

شیخ نے اگرچہ فلسفۂ اخلاق کو شاعرانہ انداز میں لکھا، لیکن مسائلِ اخلاق کے متعلق بہت سے ایسے نازک، دقیق، اور لطیف دلائل اور وجوہ بیان کیے کہ اخلاق کی فلسفیانہ تصنیفات میں بھی نہیں مل سکتے، کبر، حسد، غیبت وغیرہ خبائث نفسانی کی برائیوں کے وجوہ تمام کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن شیخ ان سب سے الگ دقیق باتیں کرتا ہے، بدگوئی کی برائی کی نسبت کہتا ہے،

بداند حق مردم نیک دید نگوئے جوان مرد صاحب خرد

کہ بد مرد را خصم خود می کنی دگر نیک مرد است بد میکنی

یعنی بدگوئی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ جس کی بدگوئی کرو گے دو صورت سے خالی نہیں، اگر وہ اچھا آدمی ہے تو اچھے آدمی کو برا کہنا مناسب نہیں، اور برا ہے تو بُرے

آدمی کو اپنا دشمن بنالینا، اچھا نہیں، یہ ظاہر ہے کہ بُرا آدمی کسی کی دشمنی کرتا ہے تو جائز ناجائز کی پروا نہیں کرتا، اسلئے بُرے آدمی کو اپنا دشمن بنانا اپنے آپ کو بلا میں پھنسانا ہے،
یہ تقسیم اور استدلال جس قدر فلسفیانہ ہے، اسی قدر واقعی اور عملی ہے۔

یا مثلاً خاموشی کی خوبیاں تمام اخلاقی کتابوں میں مختلف طریقوں سے بیان کی ہیں لیکن شیخ سب سے الگ فلسفیانہ طریقہ سے اسکو ثابت کرتا ہے،

ترا خامشی اے خداوند ہوش ... وقارست وناہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبت خود مبر ... وگر جاہلی پردۂ خود مدر

یعنی خاموشی، عالم وجاہل دونوں کے لیے مفید ہے، عالم کا تو وقار بڑھتا ہے، اور جاہل کا پردہ ڈھکا رہتا ہے،

یا مثلاً دوسروں کے اعتراض اور نکتہ چینی کا برا ماننا اور اسکو گوارا کرنا اسکو شیخ اس طرح دلنشین کرتا ہے،

گرانی کہ دشمنت گوید مرنج ... درآں عیب گو، برو یاد سنج

یعنی دو حال سے خالی نہیں، یا جو اعتراض دشمن کرتا ہے، واقعی ہے تو واقعی اور سچی بات کا برا ماننا کیا؟ اور جھوٹ اور غلط کہتا ہے تو جھوٹ بات کا کیا رنج، اسکو بکنے دو ــــــ مثلاً بدمزاج اور بداخلاق زہاد کی نسبت لکھتا ہے،

نہ خورد از عبادت برآں بے خبر ... کہ باحق نکو بود وباخلق بد
(پھل)

یعنی اس شخص نے عبادت کا پھل نہیں چکھا جو خدا کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا اور مخلوقات کے ساتھ برائی سے، یہاں یہ دقیق نکتہ بتایا ہے کہ کج خلق عابد جو عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت، اصلی نیکی اور دل کے اقتضا سے نہیں ہوتی بلکہ

سزا اور عقاب کے ڈر سے ہوتی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس سے ان کو اس قسم کا اندیشہ نہیں (بندگانِ خدا سے) اس سے وہ کج اخلاقی اور بدمزاجی اور دل آزاری کا برتاؤ کرتے ہیں،

شیخ نہایت سرسری اور معمولی واقعات سے جو رات دن لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں نہایت دقیق نکتے پیدا کرتا ہے، مثلاً چھوٹے بچوں کو لوگ میلے ٹھیلے میں ساتھ لیجاتے ہیں تو اس کے ہاتھ میں دامن دیدیتے ہیں کہ ہجوم میں کہیں بھٹک نہ جائے، شیخ کو بچپن میں یہ واقعہ پیش آیا تھا،

شیخ نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا،

ہمے یاد دارم ز عہدِ صغر	کہ عیدے بروں آمدم با پدر
ببازیچہ مشغولِ مردم شدم	در آشوبِ خلق از پدر گم شدم
برآوردم از بیقراری خروش	پدر ناگہانم بمالید گوش
کہ اے شوخ چشم آخرت چندبار	بگفتم کہ دستت ز دامن مدار
تو ہم طفلِ راہی بسعی اے فقیر	برو دامنِ نیک مرداں بگیر

یعنی جو شخص، راہِ سلوک کی ابتدائی منزلوں میں ہے وہ بچہ ہے، اس لئے اسکو مرشد کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے،

تم نے دیکھا ہوگا کہ بلی اپنے فضلہ کو خاک میں چھپا دیتی ہے کہ تم کو کچھ خیال بھی نہ آیا ہوگا لیکن شیخ اس مبتذل واقعہ سے کس قدر بڑا اخلاقی نتیجہ استنباط کرتا ہے۔

پلیدی کند گربہ برجائے خاک	چو زشتش نماید بپوشد بخاک
تو آزادی از ناپسندیدہا	نترسی کہ بروے فتد دیدہا

یعنی بلی کو اتنا خیال ہے کہ وہ اپنے فضلہ کو جو بدنما معلوم ہوتا ہے چھپا دیتی ہے تم

ہزاروں برائیاں کرتے ہو، اور لوگ دیکھتے ہیں اور تم کو شرم نہیں آتی،
ایک شخص کیچڑ میں لتھڑا ہوا مسجد میں جانے لگا، موذن نے ڈانٹا کہ نجاست کے ساتھ ایسی پاک جگہ میں جاتا ہے، شیخ پر اس کا اثر جو ہوا وہ یہ تھا۔

گل آلودہ راہِ مسجد گرفت — زبخت نگوں طالع اندر شگفت
یکے زجر کردش کہ تبت یداک — مرو دامن آلودہ درجای پاک
مرا رقتے در دل آمد بریں — کہ پاک است وخرم بہشت بریں
دراں جای پاکان امیدوار — گل آلودہ معصیت راچہ کار

بچپن میں شیخ کے والد نے شیخ کو انگوٹھی خرید کر دی تھی عیار نے مٹھائی کا لالچ دیا، ان کو انگوٹھی کی کیا قدر تھی، مٹھائی لیکر انگوٹھی دیدی واقعہ عموماً پیش آتے ہیں شیخ اس سے کس قدر عظیم الشان نتیجہ پیدا کرتا ہے،

بدر کرد ناگہ یکے مشتری — بہ شیرینی از دستم انگشتری
چو نشناسد انگشتری طفل خورد — بہ شیرینی از وے تواند برد
تو ہم قیمتِ عمر نشناختی — کہ در عیش شیرینی بر انداختی

لطف و احسان کا اثر ایک معمولی واقعہ سے اس طرح ثابت کرتے ہیں

برہ بر یکے پیشم آمد جواں — بہ تگ در پیش گوسفندے دواں
بہ دو گفتم ایں ریسمان است و بند — کہ می آید اندر پیت گوسفند
سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد — چپ و راست پوئیدن آغاز کرد
چو باز آمد از عیش و شادی بجا — مرا دید و گفت اے خداوند رائے

نہ ایں ریسماں می برد با منش — کہ احساں کمندیست در گردنش

ایک درویش کو کتے نے پاؤں میں کاٹ لیا، زخم کی تکلیف سے رات بھر وہ کراہا کیا، اسکے ایک کمسن لڑکی تھی، اس نے کہا ابا! پھر آپنے کیوں نہیں کتے کو کاٹا کہ برابر سرابر ہو جاتے، درویش نے کہا کہ جانِ من! میرے دانت کتے کے قابل نہ تھے، شیخ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تم کو اگر کوئی نااہل برا کہے اور تم بھی اس کو برا کہو تو اسکی یہی مثال ہوگی کہ آدمی کتے کو کاٹنا چاہے،

محال است اگر تیغ بر سر خورم — کہ دنداں بپائے سگ اندر برم
تواں کرد با ناکساں بدرگی — ولیکن نیاید ز مردم سگی

تخیل اور حکایات — شیخ کی انتہائے قوت تخیل کا اندازہ ان فرضی حکایتوں سے ہو سکتا ہے جو محض اسکی قوت تخیل کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جن کو وہ واقعیت اور حسن استدلال کا مجموعہ بنا دیتا ہے، مثلاً

Allegory

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائیکہ دریاست من کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم
چو خود را بچشم حقارت بدید — صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بجائے رسانید کار — کہ شد نامور لؤلؤ شاہوار

یعنی بادل سے ایک قطرہ ٹپکا، دریا کا پاٹ دیکھکر شرمایا کہ اس کے آگے میری کیا حقیقت ہے، چونکہ اس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا، سیپ نے اس کو اپنی گود میں لیا، چند روز کے بعد دیکھا تو وہی قطرہ گوہر شاہوار تھا، مثلاً

گلے خوشبوے در حمام روزے — رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — ورگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یا مثلاً — زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک — بگوشش آمد نالہ دردناک

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر — کہ چشم و بنا گوش و روی ست و سر

یعنی میں نے ایک دن ایک خاک کے ٹیلہ پر پھاوڑا مارا، اس سے آواز آئی کہ میاں اگر تم میں آدمیت اور غیرت ہے تو ذرا آہستہ، کیونکہ یہ سب آنکھیں اور کان اور چہرے اور سر ہیں،

(یعنی آج جو خاک ہے پہلے انسان کے اعضاء تھے جو بوسیدہ ہو کر خاک ہو گئے)

یا مثلاً — نگردیدہ باشی کہ در باغ و راغ — بتابد بہ شب کرمکے چوں چراغ

یکے گفتش اے مرغکِ شب فروز — چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

بہ بیں کآتشیں کرمکِ خاک زاد — جواب از سر روشنائی چہ داد

کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم — ولے پیشِ خورشید پیدا نیم

یا مثلاً

شبے یاد دارم کہ چشمم نخفت — شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت

کہ من عاشقم گر بسوزم رواست — ترا گریہ و سوز بارے چرا ست

بگفت اے ہوادار مسکین من — برفت از برم یار شیرین من

تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام — من استادہ ام تا بسوزم تمام

ترا آتش عشق اگر پر بسوخت — مرا بیں کہ از پائے تا سر بسوخت

پیرایۂ ادا

شیخ کے کمالِ شاعری کا اصلی معیار، اس کا پیرایۂ ادا ہے، اس سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ کس مضمون کے موثر کرنے کا سب سے بڑھکر کونسا

طریقہ ہے، جن جن مضامین کو اس نے لیا ہے، ان کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے متقدمین اور متاخرین میں اس کی نظیر مطلق نہیں مل سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اخلاق میں سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں ہیں صرف ایک مخزن الاسرار نظامی کے طرز پر ۵۰ مثنویاں لکھی گئیں، اور سب کی سب اخلاق و تصوف میں ہیں لیکن بوستاں اور گلستاں کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا۔ چند مثالوں سے تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو۔

مثلاً دولت و حکومت کی تنقیص ایک پامال مضمون ہے، جو سیکڑوں دفعہ لوگ مختلف پیرایوں میں ادا کر چکے ہیں، لیکن شیخ کا صرف ایک شعر سب پر بھاری ہے۔

گدا را کند یک درم سیم سیر　　　فریدوں بہ ملک عجم نیم سیر

شیخ نے اس کے ساتھ فلسفیانہ طریقہ سے ثابت کر دیا ہے کہ دولت مندی درحقیقت محتاجی ہے،

خبر دہ بہ درویش سلطاں پرست　　　کہ سلطان ز درویش مسکیں تر ست

نگہبانی ملک و دولت بلا است　　　گدا پادشاہ است نامش گدا است

بخسپند خوش روستائی و جفت　　　بہ ذوقے کہ سلطان در ایوان نخفت

(دہقان — بیوی)

اسی مضمون کو ایک مصرع میں ادا کیا ہے۔

آنانکہ غنی تر اند محتاج تر اند

یہ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر دولت مند اور امیر ہو جاتا ہے، اس کی ضرورتیں اور حاجتیں بڑھتی جاتی ہیں، اس لیے زیادہ دولت مندی درحقیقت زیادہ محتاجی ہے یا مثلاً یہ تلقین کرنا تھا کہ دولت مندوں کو غریبوں پر رحم کرنا چاہیے، اس کو شیخ نے اس حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا،

ملک صالح از پادشاہانِ شام — برون آمدے صبحدم با غلام
بگشتے در اطرافِ بازار و کوئی — به رسم عرب نیمه بربسته روی
دو درویش در مسجدے خفته یافت — پریشان دل و خاطر آشفته یافت
یکے زاں دو می گفت با دیگرے — که ہم روزِ محشر بود داورے
گر ایں بادشاہانِ گردن فراز — که با لہو و عیش اند و با کام و ناز
در آیند با عاجزاں در بہشت — من از گور سر بر نگیرم ز خشت
بہشتِ برین ملک و ماویٰ ماست — که بند غم امروز بر پای ماست
اگر صالح آں جا به دیوار باغ — در آید به کفشش بدرّم دماغ

حکایت کا ماحصل یہ ہے کہ ملک صالح (شام کا بادشاہ اور سلطان صلاح الدین کے خاندان سے تھا) ایک دن شہر کے گشت کو نکلا، دو فقیر ایک مسجد میں لیٹے تھے، اور جاڑے اور بھوک کی تکلیف سے بیتاب تھے، ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ آخر قیامت میں بھی کوئی حاکم ہوگا، اگر یہ بادشاہ لوگ جو دنیا میں مزے اڑاتے پھرتے ہیں، ہم غریبوں کے ساتھ بہشت میں داخل ہوں گے تو میں قبر سے سر نہ اٹھاؤں گا، بہشت ہمارا حصہ ہے کہ ہم آج مصیبتیں بھر رہے ہیں، چنانچہ اگر بہشت کی دیوار کے پاس بھی آیا تو اس کا سر توڑ دوں گا۔

دولت مندوں کو غریبوں پر رحم دلانے کا سب سے بڑا موثر طریقہ یہ ہے کہ تکلیف کی حالت میں غریبوں کو امیروں کے ناز و نعمت پر جو رشک، جلن اور غصہ پیدا ہوتا ہے اس کو دکھایا جائے، شیخ نے اس کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے، شعر باوجود اس کے کہ تہذیب کی حد سے بڑھا ہوا ہے واقعیت اور اصلیت کی اصلی تصویر ہے، لیکن شیخ نے اسی بنا پر اکتفا نہیں کی، بلکہ بادشاہ کے فیاضانہ طرز عمل کو بھی دکھایا۔

روان ہر دو کس را فرستاد و خواند | بہ ہیبت نشست و بر حرمت نشاند
برایشاں بہارید باران جود | فرو شست شاں گرد ذل از وجود
شہنشہ ز شادی چو گل بر شگفت | بخندید و در روی درویش گفت
من آں کس نیم کز غرور حشم | ز بیچارگاں روی در ہم کشم
من امروز کردم، در صلح باز | تو فردا مکن، در بر ویم فراز

یعنی بادشاہ نے ان فقیروں کی مہمانی اور حاجت روائی کرکے کہا کہ آج میں آپ لوگوں کے ساتھ عاجزی اور دوستی کا برتاؤ کرتا ہوں، آپ بھی میرے ساتھ قیامت میں مہربانی کیجئے گا اور مجھ کو بہشت میں آنے سے ذرد کیجئے گا۔

سننے والے پر فقیروں کے غم اور غصہ سے جو اثر پیدا ہوا تھا، وہ بادشاہ کے شریفانہ طرز عمل اور حکیمانہ جواب سے کس قدر اور زیادہ قوی ہو گیا ممکن نہیں کہ ایک دردمند دل اس کو پڑھے اور اس کے آنسو نکل نہ آئیں۔

یا مثلاً غیبت کی برائی کو، لوگوں نے مختلف پیرایوں میں ادا کیا تھا، شیخ نے سب سے زیادہ اچھے لیکن نہایت موثر طریقہ سے اس حکایت کے پیرایہ میں اس مضمون کو ادا کیا۔

طریقت شناسان ثابت قدم | بخلوت نشستند چندے بہم
یکے زاں میان غیبت آغاز کرد | در ذکر بیچارہ باز کرد
کسے گفتش اے شوریدہ رنگ | تو ہرگز غزا کردہ در فرنگ
بگفت از پس چار دیوار خویش | ہمہ عمر ننہادہ ام پائے بیش
چنیں گفت درویش صادق نفس | ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
کہ کافر ز پیکارش ایمن نشست | مسلماں ز جور زبانش نہ رست

یعنی چند آدمی ایک صحبت میں شریک تھے، ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی، ایک نیک نفس نے کہا کیوں یار! کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے، اس نے کہا میں نے تو کبھی گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالا نیک نفس نے کہا سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملہ سے محفوظ رہا، لیکن مسلمان آپ کی تیغ زبان سے نہ بچ سکا، ایک اور طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے۔

زبان کرد شخصے زغیبت دراز　　بدو گفت دانندۂ سرفراز
کہ یاد کسان پیش من بد مکن　　مرا بد گمان در حقِ خود مکن

زیادہ گوئی کی برائی نہایت پامال مضمون ہے، شیخ اس مضمون کو کس قدر عجیب اسلوب سے ادا کرتا ہے:

کمال است در نفسِ انسان سخن　　تو خود را بہ گفتار ناقص مکن

یعنی قوت ناطقہ ہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے، ایسا نہ کرو کہ یہی وصف (زیادہ گوئی کی وجہ سے) تمہارے نقصان کا سبب قرار پائے۔

کم آواز ہرگز نہ بینی خجل　　جوی مشک بہتر کہ یک تو دہ گل
حذر کن زنادان دہ مردہ گوی (لغو)　　چو دانا یکے گوی و پروردہ گوی (معقول)
صد انداختی تیر و ہر صد خطا است　　اگر ہوشمندی یک انداز و راست

یعنی سیکڑوں تیر تم نے نشانہ پر لگائے اور سب خالی گئے، اگر عقلمند ہو تو ایک تیر لگاؤ لیکن ٹھیک نشانہ پر لگاؤ۔

مناجات، تضرع، استغفار اور توبہ فی نفسہٖ ایک موثر مضمون ہے، لیکن شیخ نے اس کو ایک حکایت کے پیرایہ میں کس قدر زیادہ موثر کر دیا ہے۔

شنیدم کہ مستے ز تابِ نبید — بہ مقصورۂ عابدے بر دوید
نشہ شراب

بنالید بر آستانِ کرم — کہ یارب بہ فردوسِ اعلیٰ برم

موذن گریبان گرفتش کہ ہیں — سگ و مسجد اے فارغ از عقل و دیں

چہ شایستہ کردی کہ خواہی بہشت — نمی زیبدت ناز با روی زشت

بگفت این سخن پیر و بگریست مست — کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست

عجب داری از لطفِ پروردگار — کہ باشد گنہگارے امیدوار

ترا می نگویم کہ عذرم پذیر — در توبہ باز است و حق دستگیر

ہمی شرم دارم ز لطفِ کریم — کہ خواہم گنہ پیشِ عفوش عظیم

یعنی ایک مست نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا اور رو کر پکارا کہ اے خدا مجھکو بہشت میں لے جانا، موذن نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا کہ او سگِ نجس، مسجد میں تیرا کیا کام، تو نے کون سا اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعویٰ ہے، مست رو پڑا اور بولا کہ کیا آپ کو خدا کے لطفِ عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو، میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور خدا دستگیر ہے، مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں،

بلاغت غور کرو شیخ نے اس مضمون کو موثر کرنے کے لیے بلاغت کے کن نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے، سب سے پہلے یہ کہ مناجات میں براہ راست خدا کو مخاطب نہیں کیا، کیونکہ انسان کسی شخص کو جب مخاطب کر کے اس کی مدح یا اس کی نسبت حسنِ ظن ظاہر کرتا ہے تو اس میں ظاہر داری اور خوشامد کے مشابہ کا احتمال ہوتا ہے، یہی نکتہ ہے کہ سورہ الحمد میں خدا کی حمد صیغۂ غائب سے ادا کی ہے، موذن کی ڈانٹ بتانے سے مناجات مانگنے والے کی نسبت دل

میں رحم کا اثر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس سے اس کی نہایت مظلومی اور موذن کی بے رحمی ظاہر ہوتی ہے، اب اس کا یہ جواب کہ میں آپ سے تو رحم کا تو خواستگار نہیں، مجھ کو جس سے امید ہے، وہ اور ہی کریم النفس ذات ہے، مناجات کے قبول کے لیے کس قدر موثر ہے، یہ قاعدہ ہے کہ کوئی شخص اگر کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی مہربانی اور رحم پر اپنا بھروسا ظاہر کرے تو اس شخص کو خواہ مخواہ اس کی شرم اور اس کا پاس ہوگا ان باتوں کا مجموعی ترتیب نے مناجات اور طلبِ مغفرت کے مضمون کو نہایت موثر کر دیا ہے،

ہم نے اطناب کے ڈر سے صرف چند مثالوں پہ قناعت کی، عموماً جن مضامین کو شیخ نے ادا کیا ہے ان کا مقابلہ اور شعرا اور مصنفین سے کرو تو صاف نظر آئے گا کہ شیخ کو اس خصوصیت میں کیا ترجیح حاصل ہے،

مناظر قدرت اس قسم کے مضامین میں بہار کا مضمون سب سے زیادہ پامال ہے، اور اب تک پامال ہوتا آتا ہے، لیکن شیخ کے قصیدہ کا اب تک جواب نہ ہو سکا۔

با مدادان کہ تفاوت نکند لیل و نہار
یعنی دن اور رات برابر ہوگئے
خوش بود دامنِ صحرا و تماشائے بہار

آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب
سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار

باش، تا غنچۂ سیراب دہن باز کند
بامداداں چو سر نافۂ آہوئے تتار

باد گیسوے عروسانِ چمن شانہ کند
بوئے نسرین و قرنفل برود در اقطار

ژالہ لالہ فرود آمدہ ہنگامِ سحر
راست چوں عارضِ گلبوی عرق کردہ یار

ارغواں ریختہ، بر درگہِ خضرائے چمن
ہم چنان است کہ بر تختۂ دیبا دینار

ایں ہنوز اوّل آثارِ جہاں افروزی ست
باش تا خیمہ زند، دولتِ نیسانؔ و ایارؔ
بہار کے مہینے ہیں

شاہد دخترِ دوشیزۂ باغ اند ہنوز باش تا حاملہ گردند بہ الوانِ ثمار
رنگ برنگ کے پھل

تا نہ تاریک شود سایۂ انبوہ درخت زیر ہر برگ چراغے بنہند از گل نار

سیب را ہر طرفے دادہ طبیعت رنگے ہم بدان گونہ کہ گلگونہ کند روئے نگار

گو نظر باز کن و خلقتِ نارنج بہ بیں اے کہ باور نکنی فی الشجر الاخضر نار

آبِ دریای ترنج و بہ و بادام روان ہمچو در زیر درختانِ بہشتی انہار

غزل | یہ عموماً مسلم ہے کہ شیخ غزل کے ابوالآبا ہیں، قدماء تو سرے سے غزل کہتے ہی نہ تھے قصائد کے ابتدا میں عرب کے طرز پر جو تشبیب کہتے تھے، یہی اس زمانہ کی غزل تھی، متاخرین قدماء مثلاً انوری، ظہیر وغیرہ نے قصیدہ سے الگ کر کے غزلیں لکھیں لیکن ان میں کسی قسم کا اثر، اور کسی قسم کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی نہ تھی، البتہ چونکہ زمانہ کے امتداد سے قدرتی طور پر زبان خود روز بروز سادہ اور صاف ہوتی جاتی تھی، اس لیے غزل کی صفائی اور سادگی بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، کمال اسمٰعیل کی غزل کا نمونہ اوپر گزر چکا، اس زمانہ کے اور شعراء کی سادگی کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا۔

غزل (از محمد بن نصیر)

گل کہ شایان بادہ بود رسید آمدن وعدہ دادہ بود رسید

جنگ لالہ گذشت و لشکر گل گرچہ بستر فتادہ بود رسید

سرو آزاد، بہر سوسن راست منتظر، ایستادہ بود رسید

لالہ رفت، ارچہ پائے ور گل بود گل اگرچہ پیادہ بود رسید

دیگر (از صفی)

چہ در دست ایں کہ عشقش نام کردند ہزار آشوب، خاص و عام کردند

ہر آنچہ اندر زمانہ درد دل بود یکے کردند و عشقش نام کردند

خراباتے است اندر عشق کاں جا — زخونِ دل، می اندر جام کردند

بیک[1] ساغر دراں بت خانہ مارا — چنیں سرمست و بے آرام کردند

دیگر

فتنہ ہا بر دلم ابنار مکن، گو نہ کنم — بارہا کردۂ این کار مکن گو نہ کنم

شیخ کو سادگی اور صفائی کے متعلق کچھ کوشش نہیں کرنی پڑی، زبان اُن کے زمانہ میں موجود تھی پہلے ہی منجھ چکی تھی، شیخ نے جو باتیں غزل میں پیدا کیں، حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) شیخ کے زمانہ سے پہلے جو شعرا گذرے، وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے، ان میں سے بعضوں نے تو سرے سے عشق کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، بعضوں نے حسنِ سخن کے لیے اس سے کام لیا، لیکن وہ نرے الفاظ ہی الفاظ تھے، اندر کچھ نہ تھا، شیخ کے زمانہ میں قوم کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے، اس لیے زندگی کا جو کچھ سہارا رہ گیا تھا یہی عشق و عاشقی تھی، حسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری تھا چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیوی تعلقات سے آزاد رہا اس لیے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی، اسی آگ کے شعلے ہیں جو اس کی زبان سے نکلتے ہیں، اس نے معشوقوں کے جور و ستم اور بے مہری اور بے وفائی کے، جاں گداز صدمے اٹھائے ہیں، اس لیے اس کا سینہ، درد اور سوز و گداز کا آتشکدہ ہے، اشعار ذیل سے اس کا اندازہ کرو۔

خبر ما برسانید بہ مرغانِ چمن — کہ ہم آواز شما در قفسے افتادہ است

گر نہ دلی بہ دلدارے سپار — ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

---

[1] یہ سب غزلیں لب اللباب عوفی یزدی میں موجود ہیں۔

ماجرائے عقل پرسیدم ز عشق — گفت معزول است و فرمایش نیست

گفتم کہ عشق را بہ صبوری دوا کنم — ہر روز عشق بیشتر و صبر کمتر است

بہ خشم رفتۂ ما را کہ می برد پیغام — بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

ہمہ از دست غیر نالہ کنند — سعدی از دست خویشتن فریاد

در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش — ما ہیچ نگفتیم و حکایت بدر افتاد

گفتمش سیر ببینم مگر از دل برود — آں چناں جائے گرفتہ ست کہ مشکل برود

دلے از سنگ بباید بسر راہ وداع — کہ تحمل کند آں لحظہ کہ محمل برود

ندانمت ز کجا آں سپر بدست آری — کہ تیر آہ مرا از آسمان بگردانی

حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر — بہ سر نکوفتہ باشد در سرائے را

سعدیا! ایں ہمہ فریاد تو بے چیزے نیست — آتشے ہست کہ دود از سر آں مے آید

سعدیا! نوبتی امشب دہل صبح نکوفت — یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

دو دوست قدر شناسند حق صحبت را — کہ مدتے ببریدند و باز پیوستند

ایکہ گفتی مرد اندر سر غمخوارہ خویش — با کسے گوئی کہ در دست عنا سر دارد

(۲) شیخ سے پہلے، عشق کے واردات اور معاملات نہیں بیان کرتے تھے، شیخ پہلا شخص ہے جس نے اس کی ابتدا کی، خسرو، شرف جہاں قزوینی نے اس کو ترقی دی اور وحشی یزدی پر اس طرز کا خاتمہ ہوگیا۔

طرز کا ترقی خاتمہ

بوسہ از لب جاں بخش بدہ یا بستاں — کایں فنائی است کہ بخشند و بہا نیز کنند

شب وصل

امشب مگر بہ وقت نمی خواند ایں خروس — عشاق بس نکردہ ہنوز از کنار و بوس

تا بشنوی ز مسجد آدینہ بانگ صبح — یا از در سرائے اتابک غریو کوس

لب از لب چو چشم خروس ابلہی بود   برداشتن بہ گفتن بیہودۂ خروس

مرا راحت از زندگی دوش بود   کہ آن ماہ رویم در آغوش بود
ندانستم از غایت لطف و حسن   کہ سیم و تن یا برودوش بود
بہ دیدار و گفتار جاں پرورش   سراپائے من دیدہ و گوش بود
موذن غلط گفت بانگ نماز   مگر ہمچو من مست و مدہوش بود
(اذان)

سرمست تنگ لطیف و سادہ   در دست گرفتہ جام بادہ
در مجلس بزم بادہ نوشاں   بستہ کمر و قبا کشادہ
لعلش چو عقیق گوہر آگیں   زلفش چو کمند تاب دادہ
بنشست زمیں بحضرت شے   گرد نش بہ خدمت ایستادہ

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست   تا ندانند حریفاں کہ تو منظور منی ——

۳۔ شیخ کی غزلوں کے حسن قبول کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جو خیالات ادا کرتا ہے عموماً وہ ہوتے ہیں جو عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اس بنا پر جب اس مذاق کے لوگوں ان اشعار کو سنتے ہیں تو ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی شخص ان ہی کے خیالات کی سفارت کر رہا ہے اور ایسے دلنشین اور موثر طریقہ سے کر رہا ہے کہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے، مثلاً عشق پر ملامت کرنے کے وقت عاشق کے دل میں عموماً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی نئی بدعت نہیں سبھی اس مرض میں مبتلا ہیں اور اچھی صورت کی طرف دل کا نہ کھنچنا ہو بھی تو نہیں ہو سکتا، شیخ اسی خیال کو نہایت برجستگی اور صفائی سے ادا کرتا ہے۔

عشق بازی نہ من آخر بہ جہاں آوردم   یا گناہی است کہ اول من مسکیں کردم
گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر   کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

رفیق و مہربان و یار ہمدم — ہمہ کس دوست می دارند و من ہم

نظر بر نیکوان رسمے است معہود — نہ ایں بدعت من آوردم بہ عالم

تو گر دعویٰ کنی پرہیزگاری — مصدق داشت واللہ اعلم

دگر گوئی کہ میلِ خاطرم نیست — من ایں دعویٰ نمی دارم مسلم

حدیثِ عشق، اگر گوئی گناہ است — گناہ اول ز حوا بود و آدم

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم — باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اس شعر کی بلاغت پر لحاظ کرو، کہنا یہ تھا کہ لوگ مجھکو عاشقی سے منع کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ معشوق کا حسن ہی ایسا دلفریب ہے کہ دل قابو میں نہیں رہ سکتا۔

اس بات کو کہ معشوق کا حسن نظر فریب ہے، یوں ادا کیا کہ یہ معشوق سے پوچھنا چاہیئے کہ وہ اس قدر حسین کیوں ہے؟ اس طرز ادا میں پھر یہ جدت کہ خود معشوق کو مخاطب بنایا، اور یہ کہا کہ یہ تو تجھ سے پوچھنا چاہیئے کہ تو اس قدر حسین کیوں ہے؟ معشوق کے حسن کی تعریف خود اس کے منھ پر، اس کا پہلو اس سے بڑھ کر کیا لطیف اور دلآویز ہو سکتا ہے۔

۴۔ شیخ پہلا شخص ہے جس نے غزل میں زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے، خیام نے رباعیوں میں اس مضمون کو ادا کیا تھا لیکن صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں شیخ کی طرح چھپی اور چبھتی ہوئی چوٹیں نہیں جن سے ریاکاروں کے دل برما جائیں۔

محتسب در نقفائے رندان ست — غافل از صوفیانِ شاہد باز

یعنی محتسب رندوں کا تعاقب کرتا پھرتا ہے لیکن شاہد باز صوفیوں کی

اس کو خبر تک نہیں کہ یہ چھپ چھپ کر کیا کرتے ہیں۔

برون نمی رود از خانقہ یکے ہشیار — کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر — کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس مضمون کو خواجہ حافظ نے اس قدر پھیلایا کہ خاص ان کا ہوگیا، لیکن اصل بنیاد شیخ نے قائم کی۔

اے محتسب از جواں چہ پرسی — من توبہ نمی کنم کہ پیرم

اس شعر میں اوروں کے بجائے خود اپنے آپ کو ملزم قرار دیا ہے، اور یہ بلاغت کا خاص پہلو ہے۔

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں — بازی پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

۵- مدح، ذم، رزم، مرثیہ، غرض جس قدر انواع مضامین ہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار مل سکتے ہیں، لیکن اساس مضامین چند ہی ہوتے ہیں، ان ہی کو سو سو طرح الٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں، اس لیے اصلی شاعری کا حقدار وہی ہے جس نے یہ بنیادیں قائم کی ہوں، شیخ کے بعد اگرچہ غزل کو بہت ترقی ہوئی اور خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اس قدر بلند کر دیا کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی، مثلاً

سعدی	حافظ
اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم	بنال بلبل اگر بامنت سر یاری است
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے	کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است
فریاد دوستاں ہمہ از دست دشمن است	من از بیگانگاں ہرگز ننالم

حافظ	سعدی
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد	فریاد سعدی از دلِ نامہربان دوست

من ارچہ عاشقم و رند و مست و نامہ سیاہ	گر کند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر
ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند	کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

خواجہ حافظ نے نہایت لطیف طریقہ سے اس مضمون کو ادا کیا ہے، لیکن اصل خیال کی بنیاد وہی شیخ کا شعر ہے،

تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من	اے قافلہ سالار چنیں تند چہ رانی
پیادہ میروم و ہمرہاں سوار شدند	آہستہ کہ در کوہ دگر باز پس اند
ہمہ جا جلوۂ یار است چہ مسجد چہ کنشت	سجدہ گاہ یزدان بود، گو سجدہ در میخانہ باش
چہ عذر از بخت خود جوئیم کہ آں عیار شہر آشوب	اے گنج نوشدارو بر خستگاں گذر کن
بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد	مرہم بدست و مارا مجروح می گذاری

حافظ	سعدی
دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے	شبے و شمعے و گوشۂ و زیبائے
فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے	ندارم از ہمہ عالم جز این تمنائے
من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم	
اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے	اے برادر ما بہ گرداب اندریم
	آں کہ شنعت می زند بر ساحل است

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکباران ساحل ہا

دلے از سنگ بباید بسر راہ وداع
کہ تحمل کند آں لحظہ کہ محمل برود

نمی

نمی آں صبر و تحمل کہ بادمی نازی

گر تو خواہی کہ بجوئی، امروز بجوے
می نمایم بتو چوں یک دو سہ منزل برود
ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم

یہ شعر یا واسوخت کی بنیاد ہے۔

۴- شیخ سے پہلے غزل میں جو مضامین ادا کئے جاتے تھے صاف صاف سرسری طور پر ادا کردیتے تھے، شیخ نے طرزادا میں بہت سی جدتیں کیں اور بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا کئے، وہ ایک معمولی سی بات کو لیتے ہیں اور طرزادا سے اس میں انجوبگی پیدا کردیتے ہیں، مثلاً ان کو کہنا یہ تھا کہ گناہ سب کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ اور لوگ پردہ میں کرتے ہیں اور ہم ریاکاری سے چھپاتے نہیں، اس مضمون کو شیخ اس طرح ادا کرتا ہے،

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں
بازمی پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

دامن تر گناہ کو کہتے ہیں، بر آفتاب افگندن دھوپ میں ڈالنا، اور کسی کام کے علانیہ کرنے کو بھی کہتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کون نہیں کرتا، فرق یہ ہے کہ اور لوگ چھپاتے ہیں اور ہم علانیہ کرتے ہیں، دامن تر، اور بر آفتاب افگندن، کے محاورہ اور اس طرزادا نے کس قدر خوبی پیدا کردی ہے، دھوپ میں ڈال دینے سے چیز خشک ہوجاتی ہے، اس لیے یہ بھی کنایہ ہے کہ ریاکاری سے بچنا کسی نہ کسی دن ہم کو گناہ سے مجتنب بھی کردے گا یا یہ کہ خدا ایسا گناہ معاف بھی کردیگا لیکن ریاکاری کا گناہ نہ چھوٹ سکتا ہے

نہ معافی کے قابل ہے،

کشتہ بینیدم و قاتل نشناسد کہ کیست — کیں خدنگ از نظر خلق نہاں می آید

خواستم تا نظرے افگنم و باز آیم — گفت از یں کوچہ ما راہ بدر می نہ رود

جمال در نظر و شوق ہمچناں باقی — گدا اگر ہمہ عالم بہ او دہند گدا است

بعض جگہ معمولی واقعات اور حالات کو اس پیرایہ میں دکھاتے ہیں کہ نہایت عجیب ہو جاتا ہے مثلاً معشوق کی بے وفائی کو جو ایک عام بات ہے اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔

فریاد دوستاں ہمہ از دست دشمن است — فریاد سعدی از دل نامہربان دوست

یعنی اور لوگ تو دشمن کے ہاتھ سے نالاں ہوتے ہیں سعدی کی بد قسمتی دیکھو کہ اس کو دوست اور معشوق کے ہاتھ سے فریاد کرنی پڑتی ہے، یا مثلاً یہ شعر،

ہر کس از دست غیر نالہ کند — سعدی از دست خویشتن فریاد

ہر شخص اپنے کئے کو بھگتتا ہے اور یہ ایک معمولی بات ہے شیخ نے اسی بات کو طرز ادا سے ایک عجوبہ بنا دیا، یا مثلاً یہ شعر،

مبارزان جہاں قلب دشمناں شکنند — ترا چہ شد کہ ہمہ قلب دوستاں شکنی،

بعض جگہ ایک دعویٰ کرتے ہیں، جو نہایت مستبعد ہوتا ہے پھر اس کو شاعرانہ توجیہہ سے معمولی واقعہ ثابت کر دیتے ہیں، مثلاً،

یادت نمی کنم کہ ہمہ عمر زاں کہ یاد — آں کس کند کہ دلبرش از یاد می رود

پہلے مصرع میں دعویٰ کیا کہ میں کبھی معشوق کو یاد نہیں کرتا، یہ امر عاشقی کے منصب سے نہایت مستبعد تھا، اس کو اس طرح ثابت کیا کہ یاد وہ کرے جو کبھی بھولتا بھی ہو، میں کبھی بھولتا ہی نہیں تو یاد کیا کروں، ایک جگہ ممکن امعمولی واقعہ کو شاعرانہ تخییل سے ناممکن یا مستبعد

بنا دیتے ہیں، مثلاً

خلق را بید ار باید بود زآب چشم من | دیں عجب کاں دم کہ میگریم کسی بیدار نیست
من از دست تو در عالم بهنم ردی | ولیکن چوں تو در عالم نباشد
به لطفِ دلبرمن درجهاں نه بینی کس | که دوستی کند و دشمنی بیفزاید
گفته بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم | چه بگویم که غم از دل برود چوں تو بیائی

اسی طرح جدتِ ادا کے سینکڑوں اسلوب پیدا کئے، جن کی الگ الگ تشریح نہیں ہوسکتی، اشعار ذیل سے ایک عام اندازہ ہوگا،

دنبالِ تو بودن گنه از جانبِ ما نیست | با غمزه بگو تا دلِ مردم نه رباید
زمن مپرس که از دستِ او دلم چون است | از و بپرس که انگشتهاش پُر خون است
توبه کند از گناه خلق به شعبان | در رمضان نیز چشم های تو مست است

امیر خسرو کی ایک غزل ہے،

اے مسلمانان کس روزه بدینیاں دارد

یہ خیال یہیں سے لیا ہے،

من آں نیم که حلال از حرام نشناسم | شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام
چشم رفته ما را که می برد پیغام | بیا که ما سپر انداختیم اگر جنگ است
دی زمانے به سعدی به تکلف بنشست | فتنه بنشست و چو برخاست قیامت برخاست
ما نامه به او سپرده بودیم | او نافهٔ مشک ازو فرا آورد
ای تماشا گاهِ عالم روے تو | تو کجا بهرِ تماشا می روی
اے مسلمانان به فریادم رسید | کلاں خلانے بے وفائی می کند

یارِ من اوباش و قلاش است ورنہ   لیک بر من پارسائی می کند

قاضی شہرِ عاشقاں باید   کہ بہ یک شاہد اختصار کند

شاہد معشوق کو کہتے ہیں اور گواہ کو بھی، مقدمات کے ثبوت میں عموماً دو گواہ ضروری ہیں شاعر کہتا ہے کہ گو عام قاعدہ یہی ہے کہ مقدمہ کے ثبوت میں دو گواہ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن عاشقوں کے ملک میں قاضی کو ایک ہی شاہد (معشوق) پر اکتفا کرنا چاہیئے، شاہد کے دو معنی ہونے نے جو لطف پیدا کیا ہے وہ مخفی نہیں،

برخیز کہ چشم ہائے مست   خفتہ است و ہزار فتنہ بیدار

اے محتسب از جواں چہ پرسی   من توبہ نمے کنم کہ پیرم

حضرت امیر خسرو دہلوی

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے، امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں، ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے، ترکستان میں ایک شہر کش ہے، وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے، فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ بلخ کے امراء میں سے تھے، چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے، اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدے پر مامور ہوئے محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا، ایک مہم میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے،

لیکن صاحب بہارستان سخن، تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں،

"پس آنچہ دولت شاہ در تذکرہ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو در حق وے قصائد غرا ست خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادہ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بہ علت اشتراک اسمی سلطان محمد تغلق خیال کردہ"

ؔ امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں لیکن خود امیر موصوف نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب سے زیادہ قابل اعتبار ہیں اور جہاں تک ہمیں مذکور ہیں ہم نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے امیر کی دیگر تصنیفات سے بھی ان کے واقعات معلوم ہوتے ہیں چنانچہ موقع بموقع ان کے حوالے دیئے جائیں گے، ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لندن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں امیر خسرو کی تصنیفات سے ان کے حالات مرتب کئے ہیں کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہے

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے، اعز الدین علی شاہ، حسام الدین اور امیر خسرو، سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر ۷ برس کی تھی، امیر خسرو کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے، اور دو ہزار فوج کے افسر تھے، امیر خسرو [1] ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی [2] پیدا ہوئے، قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے، مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا، مجذوب صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے، لیکن ان کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے، خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت،

جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لیے مولانا اسد الدین خطاط کو مقرر کیا، لیکن امیر کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی، جو کچھ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اس کی مشق کیا کرتے تھے، خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے، وہ کبھی کبھی اسد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کے لیے بلا لیا کرتے تھے، ایک دن بلایا تو امیر خسرو بھی ساتھ گئے، خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے اسد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ موزوں غاں کرتا ہے

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں، خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے، تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ امیر خسرو ہندوستان زا ہیں، لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔ [2] پٹیالی ضلع ایٹہ گزٹیئر آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے، پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، اب ایٹہ ہے، کسی زمانہ میں دریائے گنگ اس کے نیچے بہتا تھا لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے یہاں اب اسٹیشن بھی ہے۔

معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سن لیجئے، خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی، امیر خسرو کو دی کہ کوئی شعر پڑھو، امیر نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا، سب کی آنکھیں بھر آئیں اور سب نے بے اختیار تحسین کی، ان کے استاد نے کہا شعر گوئی کا امتحان لیجئے، خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو، مو، بیضہ، تیر، خربزہ، امیر نے برجستہ کہا

ہر موئے کہ در دو زلف[۱] آں صنم است — صد بیضۂ عنبریں برآں موئے صنم است
چوں تیر مداں راس دلش راز یراکہ — چوں خربوزہ دندانش درون شکم است

خواجہ عزیز الدین کو سخت حیرت ہوئی پوچھا کیا نام ہے؟ انھوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا، انھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی چین نہیں، پھر کہا، ترک خطا است، یعنی ان کو ترک کہنا خطا ہے، انھوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا بے خطا ترک است، یعنی قطعاً وہ ترک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے اس لیے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہیے چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔

امیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی، تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵، ۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے۔

درباری تعلقات[۲] امیر خسرو جب سن رشد کو پہنچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا جو سنہ ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا، اس کے امرائے دربار میں سے کشلو خان معروف

۱؎ جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا۔ میں نے اسی طرح نقل کر دیا

۲؎ یہ تمام حالات اپنے امیر خسرو نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں۔

یہ چھجو[1] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا، اور سلطان کا بھتیجا اور بارکی کے عہدے پر مامور تھا، فرشتہ میں لکھا ہے کہ "مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا، اور مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراسان، ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا، سب لٹا دیا، یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیراہن کے سوا کچھ نہ رہا۔

امیر خسرو کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے، سب سے پہلے اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں، ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں۔

دو پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح ۔۔۔ ہمدمی باباد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است ۔۔۔ آسماں روے ملک چھجو نمود

---

[1] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں، امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان اعظم کشلو خاں عرف چھجو کے دربار میں پہنچا، اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں، بدایونی (صفحہ ۱۵۵ جلد اول) میں ہے کہ بلبن آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا، سلطان معز الدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔

فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد ابن عز الدین سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا، سلطان نے اسکو بار بک مقرر کر کے خان اعظم کو کشلی خاں خطاب دیا، بدایونی صفحہ ۱۴۴ میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ کشلو خاں خطاب ملا تھا، ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین کشلو خاں، چھجو ایک ہی شخص ہیں۔

امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے،

ز شاہاں کسے کا دلم کرد یاد ... معز الدنیا بود شہ کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا، کشلو خاں امرا میں سے تھا، بادشاہ نہ تھا، بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر کی قدر دانی کی وہ معز الدین کیقباد تھا،

امیر خسرو اکثر کشلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لیجاتے اور مجلس گرم کرتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) بھی موجود تھا، اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے، شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے، امیر خسرو نے [illegible] سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا اور صلہ کے طور پر لگن بھر کے روپے دیے، کشلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستۂ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے، چہرہ پر ملال کے آثار ظاہر ہوئے، امیر خسرو نے اس کے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی لیکن کشلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی۔[1]

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا، امیر خسرو نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا، بغرا خاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم خاص بنایا،[2] اسی زمانہ میں یعنی سنہ ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی، اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں، بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں، اور بغرا خاں کو ساتھ لیا،[3] امیر خسرو بھی اس سفر میں ساتھ گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دلی واپس آیا اور بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت

---

[1] یہ تمام حالات خود امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں [2] تاریخ فرشتہ

[3] امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں سے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے ایک اور وقت یہ ہے (باقی برصفحہ)

کی، امیر خسرو کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا، دربار کے شعراء شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے، لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ رخصت لیکر دلی میں آگئے اتفاق سے اسی زمانے میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا، وہ نہایت قابل صاحب علم فیاض اور قدرداں علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا، لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے، ایک بیاض تیار کی تھی جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کیے تھے تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسنِ انتخاب پر امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے۔

یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی، ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے، اور بیاضوں میں درج کرتے تھے[1]۔

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا سلطان محمد نے ان کو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا، اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو کر گیا تو ان کو اور ان کے ساتھ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا، پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغوان خاں ایران کا حکمراں تھا اس کے امراء میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لیکر لاہور اور دیپالپور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکل کر تیمور خاں کو شکست دی لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی ایک تالاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ) عزۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے [1] تاریخ فرشتہ

کے کنارے پانچسو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا، یہ موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا، سلطان محمد نے اپنی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار ان کو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھا کر مرگیا[1]،

امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے، چنانچہ تاتاری ان کو گرفتار کرکے بلخ لے گئے، یہ واقعہ سنہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا[2]، امیر خسرو نے نہایت پُراثر مرثیے لکھے، اور دلی بھیجے، مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے، چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید　　　آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را　　　رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد　　　برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چارسو　　　پنج آب دیگر اندر مولتاں آمد پدید
جمع شد سیارہ در چشم نگر طوفاں شود　　　چوں بہ برج آبی انجم را قراں آمد پدید

من نخواہم جز جہاں جمعیت وایں کے شود
خود محال ست ایں نبات النعش پرویں کے شود

تا چہ ساعت بد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید　　　تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید
آنچہ حاضر بود لشکر، لشکر دیگر نجست　　　زاں کہ رستم را نشاید منت لشکر کشید
چوں خبر کردندش از دشمن بدانگہ کہ فوج گشت　　　بے محابا خنجر در سر کرد و درایت بر کشید
یک کشش از مولتاں تا بہ لاہور افتاد　　　یعنی اندر عہد من کافر تو اند سر کشید

---

[1] تاریخ فرشتہ　[2] بدایونی صفحہ ۱۳۱،

آنچناں رنگیں کنم اسماں خاک از خون شاں — کز زمیں باید شفق را گونۂ احمر کشید

و اندریں تدبیر و آگہ نے کہ تدبیر فلک — صفحۂ تدبیر را خط مشیت در کشید

تا چہ ساعت بد کہ کافر بر سر لشکر کشید

جوق جوق از آب بگذشتند و ناگہ در رسید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے، اخیر کے بند جہاں شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی، اور دلی میں آئے، خان شہید کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا تھا، غیاث الدین بلبن کے دربار میں جاکر پڑھا، دربار میں کہرام پڑ گیا، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، سلطان اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا۔

امیر دلی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے، سنہ ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی، اور درباریوں نے اس کے خلاف وصیت، اس کے پوتے کیقباد کو جو بغرا خاں کا بیٹا تھا، تخت نشین کیا۔

کیقباد نے امیر خسرو کو دربار میں طلب کیا، لیکن چونکہ عنانِ سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی اور وہ امیر سے صاف نہ تھا، امیر نے تعلق پسند نہ کیا، اور خان جہاں جو امرائے شاہی میں تھا، اس کی ملازمت اختیار کی۔

خان جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر کو ساتھ لیگیا، چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں۔

خان جہاں حاتم مفلس نواز — گشت بہ اقطاع اودھ سرفراز

من کہ بدم چاکر او پیش ازاں　　کرد کرم آنچہ کہ بد پیش ازاں
تا ز چناں بخشش خاطر فریب　　بندہ شدہ لازمۂ آں رکیب
در ادوم بروز لطف چناں　　کیست کہ از لطف تابد عناں
در ادہ حد از بخشش او تا دو سال　　ہیچ غم و نالہ نبود از نشاں

دو برس تک اودھ میں رہے، ان کی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی، وہ دلی میں تھیں اور ان کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی، امیر کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی، چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے، ماں نے گلے سے لگا لیا اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے۔

مادرم آں خستۂ تیمار من　　چو نظر افگند بہ دیدار من
پردہ ز روے شفقت برگرفت　　اشک فشاں بر سرم درگرفت

کیقباد جب تختِ سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی، اس کا باپ بغرا خاں بنگال میں تھا، یہ حالت سن کر بنگال سے روانہ ہوا، کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا، چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کر کے دلی سے روانہ ہوا، راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے، آخر صلح پر خاتمہ ہوا، اور کیقباد دلی کو واپس آگیا۔

امیر خسرو نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

زہے ملک خویش چوں دو سلطاں یکے باشد　　زہے عہد خوش چوں دو پیا یکے شد
پسر بادشاہ سپہ پیچ بہر سلطاں　　کنوں ملک ہیں چو دو سلطاں یکے شد

ز مہر جہانداری و پادشاہی — جہاں را دو شاہ جہاں یکے باشد
یکے ناصر عہد محمود سلطان — کہ فرمانش در چار ارکان یکے شد
دگر شہ معز جہاں کیقباد شے — کہ در ضبطش ایران و توران یکے شد

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں، امیر خسرو کو بلا کر یہ خواہش ظاہر کی، چنانچہ امیر نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی جس میں باپ بیٹے کے مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس وقت امیر کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ساختہ گشت از روش خامہ — از پس شش ماہ چنیں نامہ
در رمضان شد باسعادت تمام — یافت قران نامۂ سعدین نام
آنچہ بہ تاریخ ز ہجرت گذشت — بود سنہ ششصد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بررسی — راست بگویم ہمہ شش بود و سی

کیقباد عیاشی میں پڑ کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مر گیا یا مارا گیا[1] اس کے بعد اس کا خورد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا، وہ بالکل بچہ تھا، تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اتار کر قید کر دیا، اب اس خاندان میں کوئی مخلص و عہدیدار سلطنت نہیں رہا تھا، اس لیے ترکی امرائے دربار میں سے ملک فیروز شایستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا، تخت سلطنت پر بیٹھا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا، وہ بڑے عظمت اور اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا اس کے ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگین طبع، خوش

---

[1] بدایونی،

صحبت تھا، شعر بھی کہتا تھا چنانچہ بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کیے ہیں۔

آن زلف پریشانت ز دو لیدہ نمے خواہم وان روی چو گلنارت تفسیدہ نمے خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی ہاں بانگ ملندست ایں پوشیدہ نمے خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے سب قابل اہل فن، موزوں طبع اور رنگین مزاج تھے، مثلاً ملک تاج الدین کرچی، ملک فخر الدین، ملک عز الدین، ملک قرابیگ، ملک نصرت، ملک حبیب، ملک کمال الدین، ابو المعالی، ملک نصیر الدین کرانی، ملک سعد الدین، ، ، ، انیس اور ہم صحبت تھے،

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لیے انتخاب کیے تھے، چنانچہ تاج الدین عراقی، خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان، اختیار الدین باقی ندمائے خاص میں تھے، ساقی، مغنی اور مطرب بھی وہ لوگ تھے جو زمانہ میں انتخاب تھے مثلاً امیر خاصہ، حمید، راجہ، نظام، محمد شاہ، نصیر خاں، بہروز[1]،

ایسے گوناں گوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لیے امیر خسرو سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا، وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی اور شاعر تو تھے ہی معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا، اسی وقت سے اس نے امیر خسرو کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا تھا، چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کر کے خاص اپنا لباس عنایت کیا تھا، تخت پر بیٹھا تو امیر کو ندیم خاص بنایا اور مصحف[2] داری اور امارت کا عہدہ دیا، اس کے ساتھ جامہ اور کمربند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا، ان کیلیے مقرر کیا، امیر خسرو جو "امیر" کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے۔

---

[1] فرشتہ [2] جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت پر سپرد ہوتی تھی، اسکو مصحف دار کہتے تھے۔

امیر نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کیے، اور تاج الفتوح نام رکھا،
اسکی تفصیلی کیفیت آگے آئیگی، جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے
سنہ ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرادیا، اور خود تخت نشین ہوا، سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا
اور بے رحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اس کی طینت کا جوہر
تھا تاہم بہت بڑے عزم و استقلال اور شوکت و شان کا فرمانروا گذرا ہے، تعجب انگیز فتوحات
اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی فیاضیاں بھی کچھ حیرت خیز نہیں، اس کا دربار فقراء، علماء،
فضلاء و شعراء سے ہر وقت معمور رہتا تھا، ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں۔[1]

قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی فخر الدین کرمانی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین
مقدم، قاضی ضیاء الدین، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی زین الدین
ناقلہ، مولانا شہرکنی، مولانا نصیر الدین رازی، مولانا علاء الدین صدر شریف، مولانا میران
مابک کلہ، مولانا نجیب الدین بیانوی، مولانا شمس الدین، مولانا صدر الدین، مولانا علاء الدین
لاہوری، قاضی شمس الدین کازرونی، مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا شمس الدین، مولانا صدر الدین
پادہ، مولانا معین الدین لوہوی، مولانا افتخار الدین رازی، مولانا ظہیر الدین اندرپتی، مولانا نجم الدین،
مولانا حمید الدین بنوری، مولانا علاء الدین کرک، مولانا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی،
مولانا کمال الدین کوہوی، مولانا وجیہ الدین کابلی، مولانا منہاج الدین، مولانا نظام الدین
کلانی، مولانا نصیر الدین کری، مولانا نصیر الدین پولی، مولانا علاء الدین تاجر، مولانا کریم الدین
جوہری، مولانا صہیب ملتانی، مولانا حمید الدین، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخار الدین
مولانا حمید الدین ملتانی، مولانا نگل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرخہ، مولانا شہاب الدین

[1] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے۔

ملتانی، مولانا فخر الدین نسوی، مولانا فخر الدین شقاقلی، مولانا علیم الدین،

قرا، مولانا شاطی، مولانا علاء الدین سفری، خواجہ زکی۔

واعظین، مولانا حسام الدین درویش، مولانا شہاب الدین، مولانا کریم،

شعراء، خواجہ حسن دہلوی، صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ،

مولانا عارف عبدالحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام

ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے ان کے

بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ وہ بھی امیر ہی کا

فیض ہے، علاء الدین نے امیر خسرو کا ایک ہزار سالانہ ٹنکہ مقرر کیا تھا، امیر نے

سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا، جس کا نام خزائن الفتوح

ہے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

سنہ ۶۹۸ھ میں امیر کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا، چنانچہ

لیلیٰ مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے،

نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا، چنانچہ ہر کتاب سلطان علاء الدین کے

نام سے معنون ہے، سب سے آخری مثنوی ہشت بہشت ہے، جو سنہ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی،

اسی زمانہ میں امیر نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ

تفصیل آئے گی، سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس کی حکومت کے بعد سنہ ۷۱۶ھ میں وفات

کی، اس کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین (حکومت ۳ ماہ) اور اس کے بعد سنہ ۷۱۶ھ میں قطب الدین

مبارک بن علاء الدین خلجی بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز

یہ کہ فرشتہ، غالباً قلم کا سہو ہوگا

اور سبک سر تھا، لیکن امیر کی قدردانی سب سے بڑھکر کی، چنانچہ امیر نے جب سنہ ۷۱۸ھ میں اس کے نام پر مثنوی سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر دے دیئے، چنانچہ خود امیر قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں،

بہ تاریخ ہمچوں من اسکندرے　　کند ہر کہ آرایش دفترے
ز گنج گراں مایۂ بے شمار　　دہم بار بنگیش نہ آں پیلوار
مرا خود دریں رہ پدیدست دلیل　　کہ میداد زر ہم ترا زوے پیل
شناسد کسے کش خرد رہنموں　　کہ از پیل بار است وزنش فزوں
چو میراث شد پیل زر دادنم　　نہ زیبا است زیں سہل تر دادنم
شہا! گنج اکرم گسترا　　معانی شناسا، سخن داورا
چنیں بخششے کز تو ہم یافتم　　در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لا مداز سحر سنج چو من　　بہ اندازۂ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نو مسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دیکر قلمدان وزارت عطا کیا تھا، اس نے سنہ ۷۲۰ھ میں قطب الدین کو قتل کرکے، خود تخت حکومت پر جلوس کیا چونکہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھردیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کیے، امراء نے بغاوت کی، چنانچہ ۴ مہینے کی حکومت کے بعد سنہ ۷۲۱ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا،

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور امراے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندو نی تھی، دربار میں پکار کر کہا کہ مجھ کو تخت سلطنت کی آرزو نہیں، خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے لیکن چونکہ خلجی خاندا

میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا، اس لئے سب نے باتفاق اسی کو بادشاہ بنایا، وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا، اس نے نہایت عدل و احسان سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔

تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے، امیر خسرو کی اس نے نہایت قدر دانی کی اور ان کو دولت اور مال سے نہال کر دیا، امیر نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا، چنانچہ اس کے نام پر تغلق نامہ لکھا، جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے،

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر خسرو ساتھ گئے، تغلق واپس آیا لیکن امیر خسرو وہیں رہ گئے، اسی اثناء میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین نے انتقال کیا، امیر یلغار کرتے ہوئے دلی میں آئے اور جو کچھ زر و مال پاس تھا، خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر دیا، ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے، چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا، خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا، لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنا چاہی لیکن ایک خواجہ سرانے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا، غرض خواجہ صاحب کے پائینتی دفن کیا، اور اس سے بڑھ کر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی[1]، ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امراء میں سے تھا، تعمیر کرایا اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ کہہ کر لوح پر کندہ کرائی۔

"شد عدیم المثل" یک تاریخ او واں دگر شد "طوطی شکر مقال"

خاندان اور آل اولاد | امیر کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی[2] ان کے ایک صاحبزادہ کا نام ملک احمد ہے، وہ شاعر تھے، اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے،

[1] خزانۂ عامرہ [2] فرشتہ حالات خسرو

ان کی شاعری نے چنداں فروغ حاصل نہیں کیا لیکن شعر و شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے، اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے، اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے، چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں، عموماً اہلِ فن اس کو تسلیم کرتے ہیں، ظہیر کا شعر ہے۔

کلاہ گوشۂ حکمِ تو از طریقِ نفاذ　　ربودہ از سرِ گردوں کلاہِ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا، جس سے مصرع کی ترکیب چست ہوگئی، کمال کی ہجو میں مشہور شعر ہے۔

ایں سہل سہل بود کہ گوگردِ سرخ خواست　　گرنانِ خواجہ خواستی آں راچہ کردمے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی

ایں سہل سہل بود کہ آبِ حیات خواست　　گرنانِ خواجہ خواستی آں راچہ کردمے

نان کے ساتھ آبِ حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا،

ایک اور شعر تھا،

گر مشک خواند خاکِ درت را فلک مرنج　　زرنج گہر بہ طعن خریدار نشکند

ملک موصوف نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا

گر لعل خواندہ سنگِ درت مشتری مرنج

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر خسرو کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے، بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ "ملک عمر چونکہ خسرو کی یادگار تھے، اس لئے بادشاہ اور درباری اس کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے، اور غنیمت جانتے تھے"

امیر خسرو کی ایک صاحبزادی تھیں، لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا، جب وہ سات برس کی

کی ہوئیں تو امیر نے لیلیٰ مجنوں لکھی، اس میں صاحب زادی سے خطاب کرتے ہیں،

اے زعفت نگندہ برقعِ نور ہم عفیفہ بنام و ہم مستور
کاش مادر تو ہم بہ چہ بودے در رحم طفلِ ہشت مہ بودے
لیک چوں دادہ خدای رواست با خدا دادگاں ستیزہ خطاست
من پذیرفتم آنچہ یزداں داد کانچہ او داد باز نتواں داد
پدرم ہم زمادر است آخر مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم نہ پیدا ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں،
پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیئے کو کون ٹال سکتا ہے،
اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا، اور میری ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی۔

صاحب زادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی، امیر خسرو اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے لیکن بیٹی سے کہتے ہیں کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر نہ جھانکنا،

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است کالت پردہ پوشیِ بدن است
پا بہ دامانِ عافیت سر کن رو بہ دیوار و پشت بر در کن
در تماشائے روزنت ہوس است روزنِ چشم سوزنِ تو بس است

امیر کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی، بڑی عمر کو بھی پہنچ کر وہ اس جوشِ محبت سے ملتے تھے، جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں، اور وہ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پہ چھوڑ دی کہ ماں دلی میں تھیں اور ان کو یاد کیا کرتی تھیں، اودھ سے جب دلی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے،

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے چنانچہ دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں، ۶۹۸ھ میں انھوں نے انتقال کیا، اسی سال ان کے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا لیلیٰ مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے،

امسال دو نور ز اخترم رفت — ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من — کم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم — چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غمم دو افتاد — فریاد کہ ماتمم دو افتاد
حیف است دو داغ چو منے را — یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دو بار برنگیرد — یک سر دو خمار برنگیرد
چو مادر من کجائی آخر — گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر — روی از چہ نمی نمائی آخر
خندان ز دل زمین برون آئی — بر گریۂ زار من بہ بخشائے
ہر جا کہ ز پای تو غباری است — ما را ز بہشت یادگاری است
ذاتِ تو کہ حفظ جانِ من بود — پشتِ من و پشتبانِ من بود
روزے کہ لبِ تو در سخن بود — پندِ تو صلاحِ کارِ من بود
امروز منم بہ مہر پیوند — خاموشی تو ہمی دہد پند

اڑتالیس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کے لیے بلکتا ہے اس کے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خونِ جگر سے

رنگین ہیں،

امیر خسرو اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے، جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے، لیکن یہ امر ان کی اصل فطرت کیخلاف تھا، درباداری، خوشامد اور شخص پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی، اور موقع بہ موقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے، لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی، جب ان کو سلطان علاءالدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا، تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں.

شب تا سحر و ز صبح تا شام ... درگوشۂ غم نگیرم آرام
باشم زبرائے نفس خود رائے ... پیش چو خودے ستادہ برپائے

اس پر مزید یہ ہوا کہ ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں پر ڈال دیا تھا، اور برکت کے لیے بیعت کرا دی تھی، خواجہ صاحب کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی، امیر خسرو کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا، وہ سرتاپا عشق تھے، اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی، آخر یہ نوبت پہنچی کہ ۷۱۳ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے، خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی، خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی اور مریدان خاص میں داخل کیا، قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ امیر نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹا دیا اور پابدامن ہو کے بیٹھ گئے،

خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت، عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی، ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے، خواجہ صاحب کی کلی ان کے

ساختہ تعلق تھا، کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کردوں گا، دعا مانگتے تھے کہ تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے، الٰہی بہ سوزِ سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش،

ایک دفعہ خواجہ صاحب لبِ دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے، امیر خسرو بھی حاضر تھے، خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو،

ع ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی، امیر نے اس کی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا ع

من قبلہ راست کردم بر طرفِ کجکلاہے

جہانگیر نے تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے، میں نے اس کا شانِ نزول پوچھا، ملا علی احمد مہرکن نے واقعہ بیان کیا، مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ غش کھا کر گرے، دیکھا تو دم نہ تھا۔[1]

خواجہ صاحب نے امیر خسرو کو "ترک اللہ" کا خطاب دیا تھا اور اسی لقب سے پکارتے تھے، امیر نے جا بجا اس پر فخر کیا ہے، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں،

ہر زباں چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت	دست ترک اللہ گیر و ہم بہ اللہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا، یہ بھی فرمایا کرتے تھے

---

[1] تزکِ جہانگیری ص ۱۸۱ مطبوعہ علی گڑھ

...... کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا،

امیر نے تصوف میں جو مدارج حاصل کیے، ان کو ہم نہ جان سکتے، اور نہ بیان کر سکتے ہیں" یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر کا ہر شعر جو تجلیاں گراتا ہے وہ اسی وادیِ ایمن کی شرر باریاں ہیں،

امیر کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں، حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے، امیر کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گزرے، آفتاب حسن کی شعاعیں ان پر بھی پڑیں، وہیں ٹھہر گئے، اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو، حسن نے کہا کہ ایک پلڑے میں روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے پلڑے میں سونا رکھے، سونے کا پلہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں، امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد و نیاز لیتا ہوں، اس انداز گفتگو نے امیر کو اور بھی بے اختیار کر دیا، فوراً نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، حسن نے گو ناوک اندازی کی تھی، لیکن خود بھی شکار ہو گئے، اسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور اپنے دلدادہ (امیر خسرو) سے اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے[1]

---

[1] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی صحت لے ہار پر تکذیب کی ہے، اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے "بہ قیاس چناں در می آید کہ حسن را بہ نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد چہ امیر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن قصائد غرا و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے میتواں یافت،"

امیر سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لیے بھی جدا نہیں ہوتے تھے، امیر نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے، چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو خسرو کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی، امیر نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی،

زیں دلِ خودکام، کارِ من برسوائی کشید　　خسروا فرمانِ دل بردن نہیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر کے ملنے سے منع کر دیا لیکن کچھ اثر نہ ہوا خان شہید نے غصہ میں آ کر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے، حسن سیدھے خسرو کے پاس گئے، خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا، نہایت متحیر ہوا، اور امیر کو بلوا بھیجا، آئے تو کہا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہاتھ نکال کر دکھایا اور کہا، ع

گواہ عاشقِ صادق در آستین باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں خسرو کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے[1]

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے، اور صنفِ غزل پر ان کا خاص احسان ہے، اس لیے ان کے شیدائی، امیر خسرو ہی کے تذکرہ میں ان کے اشعار نقل کرتے ہیں.

خلق گوید دل از صبر بجا آور باز　　اے دل از صبر نشانے دہ اگر بجا ست
یکہ نظارۂ دیوانہ نہ کردی ہرگز　　قدمے رنجہ کن ایں سوئے کہ رسوائے ہست

---

[1] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں، لیکن خیر کا واقعہ آجکل کون تسلیم کریگا.

بے چون تو، کسے دگر گزیدن — کارے دگرست، کارِ من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من — ایں از فلک ست از حسن نیست

باز ایں دلم بہ سوی دلآرام می رود — از دامِ جستہ، بار سوے دام می رود
ایام در نیامدہ با مایہ دوستی — واں شوخ ہم بہ سیرت ایام می رود

اے خواجہ! در محلۂ تقوی قیام گیر — دیگر کسی عاشقی نتواں نیکنام شد
عقلم کہ زیں بر ابلقِ ایام می نہاد — آخر بتازیانۂ عشق تو رام شد

طرفہ سرو کارے است کہ با وعدۂ معشوق — صابر نتواں بود و تقاضا نتواں کرد
از حسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست — ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم می دانی

دوش بارے باتو گفتم کہ مرا ہیچ لبستاں — نہ شد اتفاق، شاید کہ بہ ایں بہا گرانم
تلخ کردم جہانیاں را خواب — زاں دعا ہا کہ مستجاب نبود

اے حسن یار گر خطا کرد — ہم شکایت از و، صواب نبود
بہ تقوی نام نیکو بردہ بودم — نکو رویاں، مرا بدنام کردند
گفتی کہ چرا حالِ دلِ خویش نہ گوئی — من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رسانند

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز اور جذبہ و اثر ان کے کلام میں موجود ہے، ان کے کشتۂ محبت (امیر خسرو) میں بھی نہیں،

جامعیت اور کمالات | ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے، صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی،

نظیری بے شبہہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں، لیکن ان کے حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہات نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری .... غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہای سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع وبدائع کا تو شمار نہیں، تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے، صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے، لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں، اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے، لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے، امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے، اور قدماء کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں، چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں،

انواع شاعری

اشعار کی تعداد

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے، اسی قدر برج بھاکا میں ہے، کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں،

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں۔

سنسکرت دانی

...... ـــــ سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں ذکر کیا ہے، ع

من قدرے ز بیشترِ ایشاں دانستم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے، اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے، انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زورِ صنائع و بدائع پر بیکار گیا، لیکن ان کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

موسیقی | موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب، ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کرسکا، چنانچہ اس کی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہے،

فقر و تصوف | ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالمِ قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا۔

عدیم الفرصتی | ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لیے وقت کس قدر ملتا تھا تو سخت حیرت ہوتی ہے، وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی، کام جو سپرد تھا وہ شاعری نہ تھی بلکہ ادرا و راشغال تھے، لیلیٰ مجنون کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

مسکین من مستمند مدہوش از سوختگی چو دیگ پرجوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام در گوشۂ غم نہ گیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رای پیش چو خودی ستادہ برپای

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں۔

تا خون نہ رود ز پاے تا سر دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا، کھانا کھانے کو نہیں ملتا،

ان حالات کے ساتھ اگر صائب قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا۔

موسیقی امیر کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا، ان کے زمانہ کا مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا، نایک گوپال تھا۔ اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لے کر چلتے تھے، سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا، امیر خسرو نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں، نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کیجائے، نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا، ساتویں دفعہ امیر بھی اپنے شاگردوں کو لیکر دربار میں آئے، گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا، ان سے گانے کی فرمائش کی، امیر نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا کچھ یوں ہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

گوپال نے گانا شروع کیا، امیر نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں، پھر خود اس کو ادا کیا، گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا، امیر نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں، غرض گوپال جو راگ گاتا اور امیر ادا کرتا تھا، اور اس کو اپنا ایجاد ثابت کرتے جاتے تھے، بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں، پھر جو گایا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا۔[1]

---

[1] عالمگیری امرا میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خاں تھا، ایک مشہور امیر تھا، ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے:

گفتگوے طوطی از آئینہ می خیزد علی ۔۔۔ گر نباشد سیف خاں از نغمہ دم بار نیست

امیر خسرو چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے، اس لیے انھوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دیکر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، چنانچہ ان کے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں۔[1]

نام راگہائے مخترعہ امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہے،
مجیر	غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
سازگری	پوربی، گورا، کنگلی اور ایک فارسی راگ۔
	قران السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں
	زمزمۂ سازگری در عراق
	کردہ بہ گلبانگ عراق نفاق
ایمن	ہنڈول اور نیریز
عشاق	سارنگ اور بسنت اور نوا
موافق	توڑی، مالوی، دوگاہ، حسینی
غنم	پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے۔
زلیف	کھٹ راگ میں شہناز کو ملا دیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا، فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک کتوہل تھی فقیر اللہ نے اس کا فارسی ترجمہ کیا اور بہت سے فوائد اضافہ کیے، اور اس کا نام راگ درپن رکھا، چنانچہ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۱۲۹ مطبوعہ کلکتہ میں یہ تفصیل مذکور ہے، اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گوپال کا ذکر اور آئندہ امیر خسرو کے ایجادات میں نے اسی کتاب سے لئے ہیں۔

[1] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں، دونوں غلط ہیں اسلئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے، اس لئے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے۔

فرغنہ	کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے۔
سرپردہ	سارنگ، بلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے۔
باخرز	دلیکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا۔
فرودست (یا) پھردوست	کانہڑا، گوری پوربی اور فارسی راگ سے مرکب ہے،
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل ہے۔

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں تو موسیقی کا کمال دکھایا ہے، باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کر کے دوسرا نام رکھدیا ہے۔ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیر خسرو کی ایجاد ہیں۔ ان میں سے بعض خاص اُن کی ایجاد ہیں، بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے، امیر نے ان میں کچھ تصرف کر کے نام بدل دیا۔

تصانیف | جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر خسرو نے ۹۹ کتابیں تصنیف کیں، یہ بھی مشہور ہے کہ امیر نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں، اوحدی نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے۔

امیر کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں، چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے، اس بنا پر اُن کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴، ۵ لاکھ سطریں ہوں، تو چنداں تعجب نہیں، لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھدیا، ہندی کلام مدون نہیں ہوا، اس لیے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے،

بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں، وہ بھی کم نہیں، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دیوان تحفۃ الصغر[1]	اس کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے،
دیوان وسط الحیات	اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۲۴ یا ۳۴ برس کا کلام ہے، اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید کشلو خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں۔
غرۃ الکمال	یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا، ۳۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے، دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانحعمری لکھی ہے، سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں، ۶۹۳ھ میں اس کی ترتیب کی اور دیباچہ لکھا،
بقیہ نقیہ	بڑھاپے کا کلام ہے، تاریخ تالیف مذکور

[1] امیر نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں، تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اسوقت میرے پیش نظر ہے اور دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں لیکن اسوقت سامنے نہیں، اسلئے ان کی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر آئی، ای ڈی) کے اس ریویو سے ماخوذ ہے جو انھوں نے برٹش میوزیم کے کتبخانہ کی فہرست میں لکھے ہیں، اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر پروفیسر پونہ کالج کا ممنون ہوں

نہیں، لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے، اس لیے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے

نہایۃ الکمال پانچواں دیوان ہے اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدح میں ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سنہ میں خسرو نے انتقال کیا ہے۔

قران السعدین سب سے پہلی مثنوی ہے، ۶۸۸ھ میں جب کہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی، کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے۔

مطلع الانوار مخزن الاسرار کا جواب ہے سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی، ۳۳۱۰ شعر ہیں، دو ہفتہ میں تمام ہوئی، سال اختتام ۶۹۸ھ ہے، تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے

شیریں خسرو رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی ۴۱۲۴ شعر ہیں

آئینۂ سکندری سکندر نامہ کا جواب ہے سالِ اختتام ۶۹۹ھ ہے اشعار کی تعداد ۴۴۵۰ ہے۔

لیلیٰ مجنوں ۲۶۶۰ شعر ہیں، ۶۹۸ھ میں نظم ہوئی،

ہشت بہشت

سلسلۂ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے،
ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے، سنہ ۷۰۱ھ
میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں۔
پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے
نام پر ہے، کل ۱۸ ہزار شعر ہیں، خمسۂ نظامی
میں ۲۸ ہزار شعر ہیں، یہ پانچوں کتابیں دو
برس کی مدت میں تمام ہوئیں۔

مفتاح الفتوح

سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی
کے سال اول یعنی سنہ ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر
سنہ ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں اور اسی سنہ
میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی، مطلع یہ ہے
سخن بر نام شاہے کردم آغاز

نہ سپہر

قطب الدین خلجی کے نام پر ہے، نو باب ہیں،
اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے، اس مناسبت
سے نہ سپہر نام رکھا ہے، اس وقت امیر خسرو
کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی، سنہ ۷۱۸ھ میں
تمام ہوئی،

دول رانی

گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی، خضر خاں
سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا، وہ دول

رانی پر عاشق ہو گیا تھا، اور اس سے شادی کی، خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے، اس کی فرمائش سے امیر خسرو نے اس کو نظم کا لباس پہنایا، اور عشقیہ نام رکھا، چار مہینے میں تمام ہوئی ۴۲۰۰ شعر تھے، خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے، ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا، ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔

افضل الفوائد — خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں

اعجاز خسروی — نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کیے ہیں اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں، ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی، تین جلدوں میں ہے۔

تغلق نامہ — غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں۔

خزائن الفتوح — سلطان علاء الدین کی فتوحات ہیں۔

مناقب ہند، تاریخ دہلی — ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں۔

شاعری | امیر خسرو اگرچہ ہندی نژاد تھے، لیکن ایرانی شعراء کو بھی ان کی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا، جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا، طوطی ہند جو ان کا خطاب تھا، ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں،

عرفی، بہ روح خسرو از ایں پارسی شکرد ادم — کہ کام طوطی ہندوستان شود شیریں

خواجہ حافظ، شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لیے شیراز سے دلی میں آئے، اگرچہ یہ روایت قرینِ قیاس نہیں، اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے، تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا، اور اس قدر تو تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انھوں نے بڑھاپے کا عذر کیا، اور لکھ بھیجا کہ خسرو جو ہر قابل ہیں، ان کی تربیت کی جائے، اس وقت خسرو کی عمر بتیس ۳۲ برس سے زائد نہ تھی۔

تاہم بعض بعض ایرانی شعراء قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے، عبید ایک شاعر جو امیر خسرو کا معاصر ہے کہتا ہے[1]،

غلط افتاد خسرو را زخامی — کہ سکبا پخت در دیگِ نظامی

امیر کی شاعری قدرتی تھی، وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے، ان کے باپ دادا شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے، بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے، تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ ان کی زبان سے بے اختیار

---

[1] بدایونی جلد اول ص ۲۲۲ و ۲۲۳،

سفر نکلتے تھے، دیباچۂ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

"وآں صغر سن کہ دندان می . . . . . استادِ سخن می گفتم و گوہراز دہانم میریخت"

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"چوں مرا استاذے سرآمدہ بر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے و آہے
مشکبار قلم راز سواد خطایاز آوردے"

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے استاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھکران کا تتبع کرتے تھے، جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے، اسی انداز پر کہنا شروع کرتے، خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مشکل نظر آیا، اس کے الفاظ حل کیے، لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہو سکا، پہلا دیوان بالکل بے اصلاح ہے امیر اس کو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہو گئے۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے، ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے، شہاب کی پہلے نہایت تعریف کی ہے پھر لکھتے ہیں،

من بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش	او بہ اصلاح راندہ خامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رتستم بہ تبسم	رنج بر خود نہادہ منت ہم
نظرے تیز کردہ بے شگاف	نے بہ عمیا نظارۂ بگذاف
ایں دقائق کہ سفر زنورش پیت	مو بمو شعر بیز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از دے	مس من گشتہ کیمیا از وے
ہرچہ او گفت من نہادم گوش	برکشیدم گر زشربت نوش

وانچہ نبود ز من نہ جستم پے — عیب آں بر من است نہ بر وے
یارب او چوں ز پنج نامۂ من — برد بیروں خطائے خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد — در قیامت خط امانش باد

آخیر کے شعروں میں معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر ہر بڑے مقلد نہ تھے، جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہاں استاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے، ع عیب آں بر من است نہ بر وے

کیا عجیب بات ہے وہ استاد جس کے دامن تربیت میں خسرو جیسا شخص پل کر بڑا ہو، آج اس کا نام و نشان تک معلوم نہیں،

معاصر استادوں کے علاوہ خسرو نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے، وہ ان کے کلام کو سامنے رکھکر کہتے تھے، اور اسی طرح اس سے فائدہ اٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے، اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں۔

زندہ است بہ معنی اوستادم — در نیست منش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت — شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ خسرو جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے، چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا،

کوکبۂ خسرویم شد بلند — زلزلہ در گور نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی، اور خسرو کی طرف بڑھی خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا نام لیا، دفعتہً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آستین تلوار کے سامنے کر دی، تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی، یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اسی قدر تاریخ بھی مخالف ہے، خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے، اس وقت ان کی عمر ۴۷ برس کی ہو چکی تھی، یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے، شباب کے زمانہ میں انھوں نے غرۃ الکمال مرتب کی ہے۔ اس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں،

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی، اس میں لکھتے ہیں،

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر ... در در او سر بسر آفاق پر
پختہ ازو شد چو معانی تمام ... خام بود پختن سودائے خام
بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست ... دیں رہ باریک بہ پای تو نیست
کالبدی داری و جاں اندر دست ... ہرچہ تو دانی بہ ازاں اندر دست
تا بود ایں سکہ بہ عالم درست ... برتن تو کے بود ایں سکہ چست
مثنوی او راست ثنائے بگوے ... بشنوش از دور و دعائے بگوے
ایں ہمہ زانصاف نگر زور نیست ... گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی استادم ... در نیست منش حیات دادم

غرض امیر نے کبھی اساتذہ کی استادی سے انکار نہیں کیا، وہ تمام استادوں کا نہایت ادب کرتے تھے، مطلع الانوار میں جو کہدیا ہے، وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی

امیر کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ ان کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزادانہ رائے نہیں دے سکتا، قران السعدین میں انھوں نے کیقباد اور بغراخاں کا حال لکھا ہے، لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے، اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں۔

وصف بر آں گونہ فزو ماندہ ام — کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام — کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چو منم اندر قلب کان خویش — معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب یکے نیست کہ جویند باز — چو ہمہ عیب است چہ گویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی تین قسمیں ہیں۔

۱ استاد تمام، جو کسی طرز خاص کا موجد ہو، جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی
۲ استاد نیم تمام، خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے،
۳ سارق، جو اوروں کے مضامین چرا تا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ استادی کی چار شرطیں ہیں،

۱ طرز خاص کا موجد ہو، ۲ اس کا کلام شعراء کے انداز پر ہو، ۳ صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو، ۴ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو،

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت استاد نہیں اسلئے کہ چار شرطوں

سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں، یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں، لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں، اول تو میں کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں، دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا، خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"بندہ را ازاں چہار شرط استادی کہ گفتہ شد، اول شرطے کہ
ملک طرز است بر حکم با جرلے کہ در مجرائے قلم جریاں یافت کہ چندیں استاد
اتباع کلمات بودہ ام،

چوں پیروِ طرزِ ہر استادم　　پس شاگردم نہ استادم

و شرطِ دوم آنکہ در نافہ سوادش بوی خطائے باشد ازاں نیز نتوانم زد کہ نظم
بندہ اگرچہ بیشتر روان است اما جابجا در غزل و نغز لغزیدنی ہم است
دریں دو شرط معترفم کہ از لاف استادی قرعہ بر فال نتوانم غلطانید"

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے، امیر کے کلام پر ریویو کرنے کے لیے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیلِ راہ ہو سکتی ہے امیر نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے۔

غزل	سعدی
مثنوی	نظامی
مواعظ و حکم	سنائی و خاقانی
قصائد	رضی الدین نیشاپوری و کمال اسمٰعیل خلاق المعانی

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا منہ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اس قدر

کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قرآن السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی ہے اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر نے شعر و شاعری کے متعلق دیوانوں کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں، جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے، فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں۔

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا فارسی کمی بیشی کی برداشت نہیں کر سکتے،

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لیے متعدد مترادف الفاظ ہیں، اسلئے شاعری آسان ہے، ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا، تو دوسرا موجود ہے، بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں، باوجود اس کے فارسی شعرا پر میدان شاعری تنگ نہیں،

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے، ردیف نہیں،

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے، وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں، لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا، اور وہ سرے کے بجائے تیسرا موجود ہے، ردیف کی سرے سے ضرورت نہیں، نرے قافیہ پر مدار ہے، جس قدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ، ان سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی،

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا، لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے، زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے لیکن زباندانی میں عرب عرباء سے کم نہ تھے، فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں، کہ "اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اس لیے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے۔"

امیر خسرو فن شاعری میں، جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں، خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی و نظامی، مثنوی میں، انوری اور کمال، قصائد میں، سعدی اور حافظ غزل میں، یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں، بخلاف اس کے امیر، قصائد، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں، مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا، غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے، مقابلہ کر کے دیکھ لو، کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں، تفصیل اس کے آگے آتی ہے،

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں لکھی گئیں، مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میووں اور پھلوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، امیر خسرو نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا ہے، انہوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں، اور اس کتاب سے ان کا بڑا مقصد

اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

بود در اندیشۂ من چند گاہ — کز دلِ دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم — مجمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشِ تو دہم — سکۂ ایں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خود زیں فنِ اندیشہ زائے — تا نہ نشانم نہ نشینم زپائے
وصفِ نہ زاں گونہ شد از دل بروں — کاں دگرے را بدل آید کہ چوں

اس قسم کی شاعری کا نام امیر نے وصف نگاری رکھا اور یہ نہایت موزوں نام ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھایا ہے، تاہم جس قدر ہے غنیمت ہے،

کاغذ کی تعریف

کاغذ شامی[1] شب و صبح دام — آنکہ شد آرایش صبحش ز شام
سادہ حریرے و اصلش ز خویش — با قصب و خز شدہ پیوند خویش
تا کہ حریر آمدہ اندر نورد — طرفہ حریرے کہ تواں خرد کرد
آمدہ اجزاش فراہم ز آب[2] — لیک پراگندگیش ہم ز آب
بسکہ شد از کوبش بسیار پست — پشت دوتا گردوش از یک شکست
گہ بود از دست تیغش گزر — گہ دہد از تیغ بہ مقراض سر

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا [2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا،

گر خلۂ سوزن سطر کشید   گرکشش رشتۂ دفتر کشد
حرف بحرف از قلم آرد سخن   لیک بہ پیچید ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں، ہم نے قلم انداز کر دیئے؛

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمت کار آگہاں   خانہ گردندہ بہ گرد جہاں
نادرۂ حکم خدائے حکیم   خانہ رواں، خانگیانش مقیم
اہل سفر را ہمہ بر وے گذر   ہمرہ او ساکن واو در سفر
جاریۂ ہند زبانش سلیم   حامل چندیں بچہ لیکن عقیم
بیشتر از مرغ پرد، در کشاد   بیشتر از باد رود، روز باد
رفتہ دو منزل بہ دمے بل دو چند   بارسن و سلسلۂ و تختہ بند
ہمچو کلنگاں بہ ہوا سر فراز   پرچو حواصل زدہ سوکردہ باز
ہر طرفش را بہ شتاب دگر   ہر قدمش بر سر آب دگر
گرچہ بدریا گذرد بیش و کم   آب نباشد گزرش تا شکم
دست چو در آب فرو افگند   آب بدست آرد و باز افگند
لطمہ زدہ بر رخ دریا بہ زور   آب ازاں لطمہ بہ فریاد و شور
در رہ بے آب نداند شدن   کیست کہ بے آب تواند شدن

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے، لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں،

امیر نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں، چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

"تشبیہات نو بسیار است این محل جملہ را تحمل نتواند کرد اما دو سہ نظیر برائے یاد کردن گزشتہ"

اس کے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں،

زانتظار دو ماہی ساق تو صد چشم   بزیر ہر موہ دارم چو دام ماہی گیر

مژہ ہائے کژ کہ دل آویزنت   کژ ہائے دکان قصاب است

نہے خرامش آن نازنیں بہ عیاری   کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری

امیر چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے، اس لیے تشبیہات میں ان کو برج بھاشا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی، اخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے، فارسی شعراء معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے، ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے، لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے، وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے۔

قصیدہ، مثنوی، غزل میں انھوں نے جو جدتیں پیدا کیں، ان کی تفصیل علیحدہ عنوانوں میں آگے آتی ہے،

مثنوی | مثنوی میں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، نظامی کے پیرو ہیں، نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں، رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، خسرو نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہے، البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قران السعدین یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی، اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے، لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند، رواں اور برجستہ ہے، مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا، یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط و کتابت اور حملہ کی تیاری، بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحبِ تخت تھا، اور اسی کی فرمائش سے یہ مثنوی لکھی گئی، بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا، مفصل اور آب و رنگ کے ساتھ لکھی جائیں، اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے، تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے، اس جھوٹی منطق کو امیر نے جہاں تک ہو سکا، خوب نباہا ہے، چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں۔

گر بہ گہر تاج ستان نو ام　　عیب مکن گوہر کان نو ام
در ہوس تاج ترا در سر است　　من گہرم تاج مرا درخور است
چو سرم از تخت سرافراز گشت　　تاجِ تو بر تارکِ من باز گشت
تخت جہاں بہر تو برپاے کرد　　لیک بران تخت مرا جاے کرد
ملک بہ میراث نیابد کسے　　تا نزند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نامِ پدر روشن است　　خطبہ جدیں کہ بنامِ من است
ہر دو جوانیم من و بخت من　　با دو جواں پنجہ بہم در مزن
گرچہ پدر دیت نہ کشم در ستیز　　از پئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کیں آورم　　شیر فلک را بزمیں آورم
جز تو کسے گر دم ازیں در زدے　　سرزنش تیغ منش سر زدے

لیک توئی چون بپے این سر یہ | من نہ ہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح حرف حرف پدرانہ محبت کے نشے سے چور ہے۔

اے ز نسب گشتہ سزائے سر پہ | وز پسری ہیچو پدر بے نظیر
گرچہ غبار است ز کار تو ام | سرمۂ چشم است غبار تو ام
تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے | از پے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ تو ام ز تو ایں پایہ بُرد | از تو ستانم بکہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو | من از تو و نامِ من از نامِ تو
باش بکامم کہ بکام تو ام | زندہ و تا زندہ بنامِ تو ام
خواہمت از جان کہ پناہے مرا | در تو نخواہی و نخواہی مرا
جز بہ تمنائے تو سودام نیست | بہتر ازیں ہیچ تمنام نیست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک | تاج و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم ز تو اے نیک بخت | نے خوشتم از تاج و نہ شادم ز تخت
بخت من از پائے را افلاک سود | با تو چو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان خارا گداز الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا، اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوشِ محبت میں یا کہتا ہے۔

من کہ بگلے رستہ باغ تو ام | پرتوے از نورِ چراغِ تو ام
گرچہ بر ماہ رسد افسرم | ہم بہ نہ پائے تو باشد سرم
زابرو خود کن تو اشارت بہ چیں | من سر خاقان فگنم بر زمین
تاج زمن سر ز تو افراختن | تاج ز تو، تخت ز من ساختن
در سیہ ملاقات رہی راہے تست | افسر من خدمت پائے تست

نیست مرا آں محل داں شکوہ		کز سر خود سایہ فشانم بہ کوہ

باپ بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا، باپ کو دیکھکر بے اختیار تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا، باپ نے چھاتی سے لگالیا، دیر تک دونوں جوشِ محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا،

گرم فرو جست ز تخت بلند		کرد بہ آغوش تن ارجمند

داشت بہ آغوش خودش تا بہ دیر		سیر نہ شد چوں نشود از عمر سیر

با خودش از فرش بہ اورنگ برد		تخت کیانی زکیاں را سپرد

گاہ ز دیدہ بہ نثارش گرفت		گاہ دو بارہ بہ کنارش گرفت

گاہ نظر بر رخ زیباش کرد		گاہ دل از مہر شکیباش کرد

پرسش از اندازہ زغایت گزشت		حد نوازش ز غایت گزشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں، اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ ان باتوں کو نہ لکھتا،

خمسہ خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں، یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینہ سکندری ہشت بہشت

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں، یہی ان کی تصنیف کی ترتیب ہے، چنانچہ امیر نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے، ان پانچوں کتاب کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے، اور یہ قادر الکلامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے، ان میں خسرو و امیر کا خمسہ سب سے بہتر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں، مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینۂ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر کے دل میں کبھی بے اطمینانی تھی، آئینۂ اسکندری میں لکھتے ہیں،

وگر بازگیری تو پیوند خویش | مرا خود عزیز است فرزند خویش
سزد گرچہ آواز خر، خندہ را | بود ارغنوں گوش خرسندہ را
بردیاد بخشایش داد گر | کہ برمن بہ بخشش گمارد نظر
ہنر جوئی و در عیب جوئی مکوش | ترا نیز عیبے است بر خود بپوش

نظامی کے پرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں اُن کے زورِ طبع کا یہ نمونہ ہے،

برگردوں شد از نای زریں خروش | بہ دریائے لشکر درافتاد جوش
ہزاہز در آمد بہ ہر دو سپاہ | روارو در آمد بہ خورشید و ماہ
علم سر ز عیوق برتر کشید | سنان چشم سیارہ بر سر کشید
بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت | جہانے پُر از تیر و شمشیر گشت
غبار زمیں کلہ بر ماہ بست | نفس را در دنِ گلو راہ بست
چناں گشت پردہ روی ہوا گردناک | کہ سیارہ گم کرد خودرا بہ خاک
سپاہ از زرہ موج زن تا بہ اوج | چو دریا کہ بادش در آرد بہ موج
بدریائے آہن جہاں گشتہ غرق | ہوا پُر ز تیغ و زمیں پُر ز برق
ز بانگِ ہیونانِ گیتی نورد | شدہ پُر صدا گنبد لاجورد

غرق کردنِ توسناں در شتاب — ز دریای آتش برانگیخت آب

شرارہ کہ زد نعل ہنگام رو — ستارہ بروں ریختہ از ماہ نو

نفیر زہ از چاشنی کماں — شدہ چاشنی بخش جان ہر زماں

گرہ بر گرہ دشت پیکاں زناں — زرہ بر زرہ پشت روئیں تناں

بزیر سپر تیغ رخشاں زتاب — چناں کہ گذشتہ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثنوی امیر کا اصلی مذاق نہیں، سلطان کی فرمائش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے، اور گویا بیگار ٹالتے تھے۔ چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے، اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں، کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا، اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی، میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے، تب روٹی ملتی ہے۔

مسکین من مستمند بے ہوش — از سوختگی چو دیگ در جوش

شب تا سحر و ز صبح تا شام — در گوشۂ غم نگیرم آرام

باشم ز برائے نفس خود را — پیش چو خودے ستادہ برپاے

تا خون نہ رود ز پاے تا سر — دستم نشود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب ان کے خاص مذاق کی ہے یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی انھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے،

می داد چو نظم نامہ را ہیچ
باقی نگذاشت بہر ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں، اور ان کا کلام دکھلایا ہے مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں۔

آتش زدہ گشتہ کوہ و کان ہم ۔۔۔ تفسیدہ زمین و آسماں ہم
جائے نہ کہ دیدہ را برد خواب ۔۔۔ ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب
مرغانِ چمن خزیدہ در شاخ ۔۔۔ در رفتہ چرندگاں بہ سوراخ
ریگ از تف بختہ در گرانی ۔۔۔ چوں تابہ روز میہمانی
از گرمی ریگہائے گرداں ۔۔۔ پُر آبلہ پائے رہ نوردان

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھکر کون سا موقع مل سکتا تھا، اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُر درد غزل ہے، سگِ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعراء نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے امیر خسرو نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے، مجنوں کتے سے خطاب کرتا ہے،

ہستم من و تو ہر دو شب گرد ۔۔۔ لیکن تو بنالۂ و من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے ۔۔۔ بر خاک درش زمن بنہی روے
ہر خس کہ برو گذاشت گامے ۔۔۔ از من برسانیش سلامے
ہر جا کہ نہاد پائے رو شن ۔۔۔ زنہار بہ بوسی از لب من
خواہد چو ترا درون دہلیز ۔۔۔ یادش دہی از سگِ دگر نیز
(هزور)
زنجیر خودت نہد چو بر دوش ۔۔۔ از گردن من مکن فراموش

اس پیرایہ ادا کو دیکھو، کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھکو ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو ایک اور سگِ در کو یاد دلا دینا جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھنا میری گردن کو بھول نہ جانا۔

عاشق کا پیغام و سلام سب لکھتے ہیں لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے اور کیونکر لکھتا ہے نہایت نازک مقام ہے، دیکھو امیر خسرو اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں، لیلیٰ مجنوں کو لکھتی ہے،

اے عاشق دور ماندہ چونی   وے شمع ز نور ماندہ چونی

روزت دائم کہ شب نشان است   شبہاے سیاہ بر چہ سان است

از من یکے می بری حکایت   با خود ز کہ می کنی شکایت

در گوش کہ ؟ نالہ می رسانی   در پاے کہ قطرہ می فشانی

بازار تو در کدام سوی است   سیلاب تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور دردِ دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، اب اس کی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے؟ کس سے دردِ دل کہتا ہے، کس کے آگے میرا نام لیتا ہے، یہ باتیں خود رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں، ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

آئینہ سکندری چھپ گئی ہے لیکن اس کتاب میں بھی ان کے مذاق کا جو میدان آتا ہے اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں، نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے، خاص اس موقع پر خوب زورِ طبع دکھایا ہے، جہاں وہ دل ربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے۔

خسرو نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے اور اسی طرح بت چینی کا تفاخر لکھا ہے نظامی کے تفاخر سے ملا کر دیکھو، معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں

اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے۔

مشعبد کہ داند جہاں سوختن　　زمن بایدش بازی آموختن
ہمہ خونِ خوبانِ کشمیر می خورم　　ولے نوشش بادم کہ خوش می خورم
رخِ ہر صنم ناپدید از من است　　صنم خانہ ہارا کلید از من است
سپہر آفتاب زمیں خواندم　　دگر ماہ ببیند ہمیں خواندم
سکندر کہ کرد آب حیوان ہوس　　نظیر منش بود مقصود و بس
گر او ہست کیخسرو و جام جوے　　مرا جام گیتی نمای است روے
گر از مجلس او سمن می دہد　　مرا لالۂ و گل، زتن می دمد
گر او راست بر تخت پائے نشست　　مرا در دلِ اوست جائے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہاں خراج　　من از سروراں سر ستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت درایا درند　　مرا ہر دو چوں کمتریں چاکراند
گر او دشمناں را بہ خوں خوردہ است　　مرا خونِ صد دوست در گردن است
گر او را یک آئینہ بر کف نشست　　دو آئینہ دارم من از پشت دست
کماں شے ارصد شکار افگند　　یک ابروے من صد ہزار افگند
کمندش ارصید بند مدام　　من آنم کہ صیاد گیرم بدام
گر او را کلاہے است بر آسماں　　مرا صد کلاہ است بر آستاں

ہشت بہشت | یہ سب سے آخری مثنوی ہے اور امیر کی شاعری اس میں پختگی اور پرکاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے، خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے، ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں، لیکن التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جائے اس کے

نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوئی جاتی ہے ادا کئے جائیں، تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مثلاً ایک قصّہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا، اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی بنیاد پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا، حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی، حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا، جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منھ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے، چیونٹی تار کو لئے ہوئے اوپر بڑھتی چلی گئی، حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لے کر اس سے رسّی بٹی، اور پھر ایک خاص تدبیر سے اسی کے سہارے نیچے اترا، تمام قصّہ بہت لمبا ہے، ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں،

چوں نگہ کرد خواجہ از بلا | کزنش در رسید با کالا
دادش آواز گفت بر سر تار | پارۂ قند کن بزودے یار
دہ بمورے کہ می رود بر میل (لاٹ) | تا بہ بالاش می رود تعجیل
رشتہ را زود زود می کن باز | کز نشیب آورد بسوئے فراز
ہمچناں کرد زن کہ او فرمود | داد رشتہ بمور و مور ربود
راند بالائے میل تار کشاں | رسن فتنہ بر حصار کشاں
چوں بہ نزدیک خواجہ رفت بزور | ریسماں را بود خواجہ ز دور

قصائد قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے کمال اسمٰعیل، خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں اس کا تتبع کرتے ہیں، خاقانی

کا مشہور قصیدہ ہے۔

مجلس دو آتش دادہ برایں از تجرداں از حجر ۔۔۔ ایں کرو منقل را منقرداں جام را جا داشتہ

اس کے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے، وہی انداز، وہی ترکیبیں، وہی استعارے ہیں اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے، اس لیے ۱۰۷ شعر کہہ کر دم لیا ہے، اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے، عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے۔

ہر سو جوانان توسلب ہر سو عروساں در قصب باش	طفلاں نہ خفتہ از طرب دیدہ بہ فردا داشتہ
از شیر و خرما مرد و زن در شیر خواری تن بہ تن	چوں شیر خواراں در دہن پستان خرما داشتہ
خورشید چوں سر بر زدہ گش بہ پائے در شدہ	ایماء دو بہ سوی می کدہ او در مصلا داشتہ
ناشتہ کہ می نا خوردہ گہ، در عید گہ بیہودہ رہ	سر بر بساط سجدہ گہ، دل سوی صہبا داشتہ
داروی معلول است می بل جان محلول است مے	خورشید متحول است می در طاس مینا داشتہ

انکے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بد مزہ اور پھیکے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ طرح دل سے ان کو پسند نہیں، صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں، اسلئے قصیدہ میں اور اور مضامین کو لیتے ہیں، اور ان میں زور طبع دکھلاتے ہیں، مثلاً بہار کا سماں برسات کی رُت، صبح و شام کی کیفیت، ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے،

ابر بارید و ہمہ روی زمیں را تر کرد	خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد
سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستاں فرمود	بساط خاک زدیبا و پرنیاں فرمود
چو روی نازک گل تاب آفتاب نداشت	زمانہ پرورشش از ابر سایہ باں فرمود
زلالہ خواست چمن ساغر دسبک بخشید	زابر خواست زمین تربت دواں[1] فرمود

---

[1] دواں زدن، فوراً حاضر کرنا۔

هر آنچه در ورق خویش غنچه مشکل داشت ‌‌ ‌‌ بنفشه گوش نهاد و صبا بیان فرمود

صبح کا سماں

سپیده دم که فلک روشنی به گیهان داد ‌‌ ‌‌ نسیم غالیه در دامن گلستان داد

چو چرخ پیر به رخ زد سپیدی و سرخی ‌‌ ‌‌ به ستیش آئینه داد آفتاب و خندان داد

درست مغربی آفتاب را که فلک ‌‌ ‌‌ نهاد زیر زمین بامداد تابان داد

ستاره راز چه شد دیده خیره از خورشید ‌‌ ‌‌ چو شب ز حقهٔ میناش سرمه چندان داد

غلام باد صبا ام که بامداد و پگاه ‌‌ ‌‌ صلای عیش به عشرت سرای مستان داد

باغ

نو بهارست و چمن جلوه چو حورا کرده ‌‌ ‌‌ ابر بارش ختنی لؤلؤ لالا کرده

گره طرهٔ سنبل که صبا باز شده ‌‌ ‌‌ دامن لاله پر از عنبر سارا کرده

بر گل و لاله چنان میرود آنگه قمری ‌‌ ‌‌ پای آلوده به خون پائچه بالا کرده

عاشقان رفته به گلزار و دل سوخته را ‌‌ ‌‌ به تکلف ز گل و لاله شکیبا کرده

نو بهار امسال مارا روزه فرماید همی ‌‌ ‌‌ گل چنان تر دامن از می لب نیالاید همی

بر دهان غنچه گه گه می زند بوسه نسیم ‌‌ ‌‌ کان شکرلب جز به بوسه روزه نگشاید همی

باد کهسار جام لاله را بر سنگ زد ‌‌ ‌‌ گوئیا میخواره ماه عید این چنین باید همی

نرگس غنا قدح بر دست و چشم اندر هوا ‌‌ ‌‌ گوئیا شراب خوار را ماه عید کو جوید همی

برسات

هوای خرم است و هر طرف باران همی بارد ‌‌ ‌‌ نگویم قطره کز بالا گل ریحان همی بارد

نگوں سر شاخہای سبز گوئی در ہمی چینید ‖ زبس کابر ڈرافشاں لولوی غلطاں ہمی بارد

یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ ان کے رولنے کو جھکی ہیں،

چکاں قطرہ زسرہائے انار تر تو پنداری ‖ کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندرو پنہاں ہمی بارد

خوش آں دختے کہ مطرب سماع بنگوں سرخوش ‖ خراماں در میان سبزہ و بالاں مستی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں، ان میں بحر الابرار جو بڑا بحر حاصل قصیدہ ہے، مشہور ہے، التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعویٰ اور اس کے ساتھ دلیل ہو،

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش درد سر است ‖ ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است

عاشقی رنج است مرداں را بسینہ راحت است ‖ سلسلہ بنداست شیراں را بہ گردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلف ہے لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے، جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اس کا زیور ہے ۔

مرد پنہاں در گلیمے بادشاہے عالم است ‖ تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است

راہبر دچوں در ریا کوشد مرید شہوت است ‖ بیوہ زن چوں رخ بیارا ید بہ بند شوہر است

نفس خاک تست ہر گہ نور بالا بر تو تافت ‖ سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر تارک خور است

کار ایں جا کن کہ تشویش است در محشر بسے ‖ آب زیں جا بر کہ در دریا بسے شور و شر است

ناکس و کس ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است ‖ عود و سرگیں ہر چہ در آتش فتد خاکستر است

اے برادر مادر دہر ار خورد خونت مرنج ‖ چوں ترا خون برادر بہ ز شیر مادر است

دہر خاکے را نمونہ می کند کیں مردم است ‖ بحر آبے را غلولہ می کند کیں گوہر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدت طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے اس

میار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام معصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، ان کے خالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں،

برسات کے ذکر کے بعد،

برآمد ابر در بخشش دگرزاں پایہ درغلطہ　　نگیرد ہیچ کس دستش مگر شاہِ جہاں گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل ار کم عمر شد گو باش دانی　　کہ در خور کیست عمر جاوداں را

نہالِ باغ شاہی رکنِ حق آنکہ　　ز بزم اوست رونق بوستاں را

کشادہ چہرہ کہ ماہے شدم بروئے زمیں　　در ملک بنمودم کہ آسماں ایں است

طلوع صبح کا بیان کرکے،

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست　　آسماں روئے ملک بجستجو نمود،

ندارد روی آں نازک گر ماہیچ آسیبے　　گر در سایۂ رایاتِ شاہِ کامگار آمد

طلوعِ آفتاب کے بیان کے بعد،

خورشید جہانگیر مبیندار کہ در رزم　　شمشیر کشیدہ ملک الشرق بر آمد

قصائد میں امیر نے جس قدر جدید مضامین، لطیف استعارات، نئی نئی تشبیہیں گوناگوں اسلوب پیدا کئے، اس کا احاطہ نہیں ہوسکتا، ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر اس میں بھی سب سے الگ ہیں۔

بوستاں بشگفت و روی لالہ خنداں گشت باز　　بر رخ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز

سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت　　بلبل آنکہ از خط خوباں غزل خواں گشت باز

خونِ لالہ گوئیا خواہد چکید از تیغِ کوہ　　یا چکید آں خوں کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی، سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا، امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانۂ سعدی کی شراب ہے، جو دوبارہ کھینچکر تیز ہو گئی ہے،

غزل کی جان کیا ہے ؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملاتِ عشق، عجز و نیاز، اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے، کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں، وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، اس کے لیے یہ بھی ضرور ہے، کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو، قریب الفہم خیالات ہوں، اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں، انھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں، اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلائے، یہ اجمال تھا، تفصیل ذیل میں ہے۔

بحروں کی موزونی وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں، جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی، اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے، مثلاً

سرے دارم کہ ساماں نیست اورا | بہ دل دردے کہ درماں نیست اورا
فرامش کردہ عمرم روز را ازانکہ | شبے دارم کہ پایاں نیست اورا
بہ راہ انتظارم ہست چشمے | کہ خوابے ہم پریشاں نیست اورا

یار من دل ز دوستاں برداشت | مہر دیرینہ از میاں برداشت
در دل او نہ کرد کار ارچہ | سنگ از نالہ ام فغاں برداشت
دی بہ تندی ملبند کرد ابرو | از پئے کشتنم کماں برداشت

آں دوست کہ بود برگراں شد واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر گردی اے دل دیدی کہ بہ عاقبت ہماں شد
دل بردگرے نہم و لیکن عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے راچو نامہ باز کنید نامِ من بر سرش طراز کنید
گر شمادینِ عاشقاں دارید بعد ازیں پیشِ بت نماز کنید
گاہ مردن شنیدہ ام محمود گفت روئم سوئے ایاز کنید

دادِ من آں بتِ طراز نہ داد پاسخے نیز دل نواز نہ داد
خوابِ مارا بہ بست و باز نہ کرد دلِ مارا بہ برد و باز نہ داد
تو چہ دانی نیاز مندی چیست چوں خدایت بہ کس نیاز نہ داد

سوز و گداز | سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے، اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں، کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں، کبھی خود اپنے آپ پر ان کو رحم آتا ہے۔

ماجرائے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال اے سرت گردم چہ می پرسی بہ بے خودی گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اس کو رونا آتا ہے، ٹھہر جاتا ہے، رو لیتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے، اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔

خسرو است و شب افسانہ دیار دہر یار قدرے گریہ و لب بر سرِ افسانہ رود
ناز و نوش خسرو و نیز بہ سر نیافت سر نہادہ بر سرِ زانو بخفت
اے آشنا کہ گریہ کناں میشدی دری آب از برونِ در ریز کہ آتش بجاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہیے، پھر دل پر غصہ آتا ہے، اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات ہو نہیں سکتی اس کے کہنے سے کیا فائدہ، اس معاملہ کو باندھتے ہیں:

غمزہ ام می کشد اے دل سخن صبر مگوے — وہ چہ آگہی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد می بردی اے دشمن! با عقل و دانش خیرہ — بیا تا بر مراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج اور غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، عاشق (جس کا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلّم ہے) عاشق ہو کر تمام اوصاف کو کھو چکا ہے، وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید بر آئی، اس کو کس موثر طریقہ سے ادا کیا ہے۔

جان زتن بردی و در جانی ہنوز — دردہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہہ گہہ روی خود بنمایمت — این سخن بیگانہ را گو، کاشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطان زند — درشہ رنجی بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے اور برا تمان تو فقیروں پر بھی "درشہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے،

کشتم از تیغ جفا سیت خویش را — بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فکر یاد من — شب نمی خسپد کسے در کوی تو

صبر طلب می کنند از دل عاشق — ہیچ خراجے کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول لگایا جائے۔

ای دیدہ چہ ریزی از پے دل آب — کیں شعلہ بہ جاں گرفت مارا

ای خواب برو کہ با تو امشب — سودای فلاں گرفت مارا

ای عشق کار تو بہ چو من ناکسے افتاد — گویا کسے نماند جہانِ خراب را

دل ندارم غم جاناں بچہ بتوانم خورد — بیش ازیں گرچہ غمے بود دلے ہم بودہ است

کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بہ من — از شب تیرہ، بجز بہ کس کہ محرم بودہ است

بیا بر دوستاں جاناں قضا کن — ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل یار سوی آں بت بد خو چہ میرود — آں خو گرفتہ باز دراں کوچہ میرود

جاں میرود ز تن چو گرہ من زند بہ زلف — مردن مرا است از گرہ او چہ میرود

گر بہ بینی دل ویرانِ مرا — گوئیا ہیچ گہ آباد نبود

کافرے رخت دلم غارت کرد — شہرِ اسلام مرا داد نہ بود
میر انشا نے زیبا کیا

کرشمہ چند کنی بر من آخر ایں جان است — نمی دہد ز زمین و صبا نمی آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی۔

کرشمہ چند کنی بامن آخر ایں جان است — نمی دہد ز زمین ز آسماں نمی بارد

بہ لب رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدتِ اسلوب | غزل کی ترقی کا نور جز لطفِ ادا اور جدتِ اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں، لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا، امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کئے جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے، مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں،

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز — دردہا دادی و درمانی ہنوز

مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرائے میں ادا کرتے ہیں،

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے، اسی مضمون کو دیکھو امیر نے کس انداز سے کہا ہے،

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا، عام مضمون ہے، اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے،

گل چہ داند کہ در دل بلبل چیست　　او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اس کو یوں باز رکھتے ہیں،

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا،

می روی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ می کنی　　از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

سعدی کا شعر ہے،

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہوسکتی تھی، لیکن امیر نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی　　زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں،

بہ آفتِ تقویٰ و آخر ایں ہمی دانی　　کہ در شہر مسلمانان نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے، بجائے اس کے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے، گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں، بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے۔

معشوق کی زیادتیِ لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

جان ز نظارہ خراب و ناز او ز اندازہ بیش　　ما بہ بوی مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک در لطیف خیال پیدا کیا،

شرابِ لطف پُر در جام میریزی و می ترسم　　کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

اکثر جگہ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کرتے ہیں،

چشم بد دور از چناں روئے　　کہ از و چشم دور نتواں کرد

مرداں در من و بیہوشی من حیراں شد　　من دراں کس کہ ترا بیند و حیراں نہ شود

گفتیم ناخوشش بچرائی خسرو　　چوں کنم؟ آں قد و آں بالا خوش است

گفتم کہ ہمیں ترا غلامم　　گر ہست گناہ من ہمیں است

دہنت ذرۂ کم از ذرہ است　　رخ ز خورشید ذرۂ کم نیست

ایہام یعنی ذو معنیین الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں،

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم　　چہ خوش بودی اگر بودی زبانش در دہانِ من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود — کہ دلم ہیچ دلستاں نبرد
تو بہ بردی ہمہ یقین مرا — ق بہ طریقے کہ کس گماں نبرد

دی روئے تو دیدم و نہ مردم — شرمندہ بماندہ ام ز رویت
دیگر سر آں نیست کہ من زہد فروشم — ساقی قدحے بادہ کہ بر روی تو نوشم

اکثر جگہ جملۂ معترضہ یا شرطیہ جملہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں، اور یہ ان کا خاص مذاق ہے۔

برو اے باد! بوسے زن برآں پائے — دگر چیزے نگوید بر دہاں ہم
غمزۂ تو بر صف سلطاں زند — ورنہ رنجے بر دل درویش ہم
رشکم آید کہ برم پیش تو نام دگراں — دگر انصاف بود پیش تو ہم نتواں گفت
کشتم از تیغ جفایت خویش را — بر تو آساں کردم و بر خویش ہم
غمے دارم کہ با واز دوستان دور — بحق دوستی کز دشمناں ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی | مولوی غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں[1]،

مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت،

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست
تا نداند رقیباں کہ تو منظور منی

اما ناسخ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید و اساس آں را بلند ساخت ۔

[1] خزانۂ عامرہ ص ۲۹ ۔

عشق و ہوسبازی میں جو حالات پیش آتے ہیں ان کے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں، اہل لکھنؤ نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے، بہر حال اس طرز کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں۔

شرف قزوینی، ولی دشت بیاضی اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہنچا دیا۔ آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں۔

خوش زباں کہ بہ رویش نظر نہفتہ کنم — چو سوی من نگرد او، نظر نگہ دارم

غلام آں نفسم کادم چو خانہ او — بہ چشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بر در ش بسیار، دربان گفت ایں کیں — گزتا رات شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر خسرو کے کلام کے زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے نازک لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں،

چند گویند کہ گہ گہ بہ دلش می گذری — ایں حدیثے است کہ بہر دل ما نیز کنند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو؟ تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے، لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے یونہی کہہ دیا کرتے ہیں، اس لیے اعتبار کیونکر آئے،

جانا! اگر شبیت دہن بر دہنت نہم — خود را بجواب سازو مگوکیں دہان کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے منھ پر منھ رکھ دوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا، یہ نہ کہنا کہ اے یہ کس کا منھ ہے

دل من مست بود و غصۂ دوست — گہے ز انجام و گہ ز آغاز می گفت

اندک اندک گہ گہے با یار بودن خوش بود — در بلیسر گرد وم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ می نمائی بہ بر کہ بودی؟ امشب — کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

مست آں ذوقم کہ شب در کوئی خویشم دیدہ گفت کیست ایں ؟ گفتند مسکینے گدائی می کند

جان باد فدائت آندم کز لبد دو سہ بوسہ گویم کہ یکے دیگر ، گوئی تو کہ نتوانم

وعدہ می خواہم و در بند وفا نیز نیم غرض آنست کہ بارے بہ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال | عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہوگئی ہے، جس کا نام علمی زبان ہے۔

سعدی، نظامی وغیرہ کی بولنے کی زبان اگر قلم بند کی جائے تو بوستاں اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی ہے، بلکہ آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں دقت ہوگی، لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے، بے شبہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں، جو عام زبان میں ادا نہیں ہوسکتے ہیں، اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے، خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہئے کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔

قدماء میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے، سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے، اس کا ایک بڑا گر یہی ہے،

امیر خسرو کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں، اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں، جو ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اس زمانے کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں،

دل بسے بردہ، نکو بشناس　　آں کہ مجروح تر از آنِ من است

یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں، خوب غور کر کے دیکھو جو بہت زخمی ہو، وہی میرا دل ہے

صبح روئے تو بہ بنیاں کہ بر آ امروز　　نیست امکاں کہ چو من سوختہ تا شام کشد[1]

لب و دہان و رخت ہر یکے بلائے دل اند　　یکے دلم چہ کند، جانب کدام شود

یعنی تیرا لب، دہن، اور چہرہ، سب بلا ہیں، میرا دل کیا کرے، کدھر کدھر جائے،

گفتم ای دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی　　عاقبت رفت و ہماں گفتۂ من پیش آمد[2]

خلقے براہ منتظر جاں سپردن اند　　ای ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر
ذرا باگ روک کے

بوسہ گفت و زباں گرداند　　خود بہ گوید و سے گرداند

بوسہ دینے کو کہا اور پلٹ گیا، آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے،

بوئے خوشم آید از تو در جیب　　گل داری یا ہمین است بویت

تیرے بدن سے خوشبو آ رہی ہے، تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے

خشک سالی است دریں عہد خالے رشک　　زاں جوالی کہ تو می آئی باراں چون است
جدھر سے تم آتے ہو ادھر بارش کیسی ہے.

ای گل، دہن تنگ صد تنگ شکر چیزے　　گل با تو نمی ماند در حسن مگر چیزے
تو ذرا سا

گویم غم دوری دم بیش گوئی کہ بتر خواہم　　بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو بتر چیزے

چو سبزۂ خویشش را خط تو خواند جائے آں باشد　　کہ گل از خندہ بر خاک او فتد غنچہ شکم گیرد

یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

دلم می خواستی بر ہم عفاک اللہ چناں دیدی　　مرامی خواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

[1] تا شام کشد یعنی شام تک زندہ رہ جائے　[2] یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا،

ای صبا دی که نلانے به چمن سے می خورد — ایں یاد من گم گشته ز ندا سے کرد

از کجا آمدی ای باد که دیوانه شدم — بوی گل نیست که می آمدیم ایں بوی کسی است

دل من دور نه رفت است نگوے دانم — باز جویید ہمیں جای که در کوی کسی است

مشتبه می شوم قبله ز رویت چه کنم — کز ابروئے تو چشم بدو محراب افتاد

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھکو قبلہ میں دھوکا سا ہوتا ہے کیونکہ مجھ کو تیرے ابرو سے دو محرابیں نظر آتی ہیں،

ز رخ جلوه نمود و مرا گفت تو مبیں — زیبا ذوق مست و بے خبرم کاں سخن چه بود

سب کو منھ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ، میں اسقدر مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہدی،

ساکنان سر کوے تو نباشند بہوش — کاں زمینے است که آنجا ہمه مجنوں خیزد

ز چشمت کاروانِ صبرِ من تاراج کافر شد — مسلمانان کسے دیداست کاندر شہر راه افتد

مسلمانو! کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے،

بدبازی سوے من آمد به شوخی دل زمن بستد — بدو گفتم چه خواہی کرد گفتا کار می آید

عام محاورہ بکار می آید ہے، کار می آید، امیر خسرو کے سوا اور کسی کے

کلام میں نظر سے نہیں گذرا،

حسنِ تو علی بجز اہ سوخت — ہم در آغاز می تواں دانست

نرخ کردی به بوسه جانی — بنده بخرید رائیگاں دانست

تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی، میں نے خرید ا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا۔

از بہر آں که لاف جمالِ تو میزند — صد بار لاله بر دہن یاسمیں زده است

ما جان فدای خنجرِ تسلیم کرده ایم — خواہی به بخش و خواه بکش رای رای تست

ساقی بیار مے که چناں سوخت دل ز عشق — کز سوز ایں کباب ہمه خانه بوگرفت

راست کردی زابروان محراب   می نماید بناز خواہی کرد

ابروؤں سے تونے محراب درست کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے،

من آن ترکِ طنّاز را می شناسم   من آن مایۂ ناز را می شناسم

شبم تازہ شد جاں بہ دشنام سنتی   تو بودی من آواز را می شناسم

باد صبا چو از رخِ او زلف در ربود   ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد

توحالِ من ہم از لبِ ردی زرد می بردں بر   کہ من بہ روی تو پیدا[1] نمی توانم کرد

سالہا شد کہ نیابم خبر و در کوئیت   دل ویراں شدہ را آیم و آواز کنم

من از سر زندہ گردم، گر تو یار ایک سخنگوئی   تو می دانم نگوئی، لیک من گفتار میگویم

مجھکو معلوم ہے کہ تم نہ کہوگے لیکن میں بات کہتا ہوں۔

دعوئی خون بہای دلِ خویش می کنم   یک بوسہ بر لبم زن و الا کلام کن

امیرؔ نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُن کے سوا کسی اور اہلِ زبان کے کلام میں نہیں ملتے، مثلاً

از گرہ او چہ می رود

آواز کردن، پکارنا

گفتار می گویم، یوں ہی ایک بات کہتا ہوں

والا کلام کردن، کسی کو ساکت اور بند کرنا،

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں، ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن چونکہ ہم کو اپنے

---

[1] پیدا کردن، ظاہر کرنا،

تتبع اور استقرار پر اعتماد نہیں، اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہوسکتے۔

تسلسل مضامین غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے، مائذ کا موضوع مدح ہے، مثنویاں، قصے اخلاق کے لئے مخصوص ہیں، قطعات میں ہم اور باتیں ہوتی ہیں، عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے اور ہوں! کیونکر کریں؟ اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے، لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا بہت کم رواج ہوا، امیر خسرو نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے رازدار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ، دیکھو کس اشتیاق، کس حسرت، کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں۔

اے صبا باز بہ من گوی کہ جاناں چون است ‌‌ آں گل تازہ و آں غنچہ خنداں چون است؟
باکہ مے می خورد آں ظالم و در می خوردن ‌‌ آں رخ پر خوی و آں زلف پریشاں چون است؟
چشم بدخوش کہ ہشیار نہ باشد مست است ‌‌ چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چون است؟
روی و زلف بت عیار کہ آں ہر دو خوش اند ‌‌ دل دیوانہ من پہلوی ایشاں چون است؟
روزہا شد کہ دلم رفت و در آں زلف بماند ‌‌ باز بیں آں یوسف گم گشتہ زنداں چون است؟

پوچھتے پوچھتے دفعتہً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلاف عاشقی ہے اسلئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے،

ہم بہ جان و سر جاناں کہ کم و بیش مگوے ‌‌ گو ہمیں یک سخن راست کہ جاناں چون است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم ادھر ادھر کی باتیں نہ کہہ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے،

معشوق نے روزہ رکھاہے، اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں ان کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے؛

ماہ من روزہ میان شکرستان دارد		ای خوش آں روزہ کہ جا در لب جاناں دارد
لب می آلود دہاں پر شکر ذکرش ہست		ای مسلماناں ایں کس روزہ بہ پنہاں دارد
خضر گر پیش آید شکند روزۂ خویش		کاں لب سبزہ دہنت لب چشمۂ حیواں دارد
خون من می خورد آخر دہنش پنہاں نیست		من گرفتم کہ تو دا روزۂ پنہاں دارد
جان من گر تو قدم رنجہ کنی بندۂ تو		فدیۂ آب دو چشم و دل بریاں دارد

معشوق سر و سامان کے ساتھ سوار آرہا ہے، عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آرہی ہے پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آتا ہے لیکن ان دل فریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا، اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہیے، ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں،

کہ می آید؟ چنیں یارب مگر مہ بر زمیں آمد		چہ گرد است اینکہ می خیزد کہ با جاناں ہمعناں آمد
کہ می راند جنیبت را کہ میداں عنبر آگیں شد		کدامیں باد می جنبد کہ بوئے یاسمیں آمد
بتی و آفت تقوی و آخر ایں ہمی دانی		کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

بہار آئی ہے، عاشق باغ میں جاتا ہے مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں، قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے، سبزۂ لب جو اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے، قاصد سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ادھر ادھر کی باتوں میں ٹالنا چاہے تو نہ ماننا اور جس طرح ہو سکے ساتھ لانا، اور اگر عالم مستی میں ہو تو اسی طرح مست اٹھا لانا، ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ہے۔

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش   وقتے است خوش بہار کہ وقتِ بہار[1] خوش

در باغ باز تازہ بلبل درین ہوا   مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش

مائیم و مطربے و شرابے و محرمے   جامے بزیرِ سایۂ شاخِ چنار خوش

اے باد کاہلی مکن و سوئے دوست رو   مارا بکن بہ آمدنِ آں نگار خوش

چیزے دگر مگوئے ہمیں گو کہ در چمن   سبزہ خوش است و آب خوش و جوئبار خوش

گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد   پیشش کن و بیار مشو زینہار خوش

در پیشش کہ مست بود خفتنش مدہ   ہم ہمچنانش مست بہ نزدِ من آر خوش

من مست خوش حریفی ادیم کہ آں حریف   سرخوش خوش است و مست خوش و ہوشیار خوش

بادہ دراں زماں کہ منش راہ می دہد   بازی خوش است و بوسہ خوش است و کنار خوش

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن ولیک   آں سروِ من پیادہ خوش است و سوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہیئے؟ اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

ہنگامِ گل است بادہ باید   ساقی و حریفِ سادہ باید

گر غنچہ گرہ در ابرو افگند   پیشانیِ گل کشادہ باید

ساقی برخیز و یار بنشاں   کیں شیشہ و آں ستادہ باید

وانگاہ، حریفِ سادہ دست   در چنگِ منِ افتادہ باید

بہار کا سامان،

بوستاں جلوہ در گرفت اینک   گل ز رخ پردہ در گرفت اینک

---

[1] وقتے کسے خوش بودن دعائیہ جملہ ہے یعنی خدا ان کو خوش و خرم رکھے،

آتشِ لالہ بر فروخت زباد — دامنِ کوہ در گرفت اینک
بلبل آمد نشست بر سرِ گل — بے نوا بود زر گرفت اینک
غنچہ در پیش فاختہ ز اصول (موسیقی) — سبقے تازہ برگرفت اینک
ورقِ غنچہ را کہ زرشتہ بود — ورقش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے، اس لئے چپک کر رہ گئے۔

آب را گرچہ چشم ہا پاک است — بوستاں را ببر گرفت اینک

یعنی پانی کو پاک نظر ہے۔ تاہم اس نے باغ کو سینہ سے لپٹا لیا۔

خار چوں تیز کرد پیکاں را — گل بعہد تو سپر گرفت اینک
طوطی آغاز شعر خسرو کرد — روئے گل در شکر گرفت اینک

جدت جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، امیر کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں، اور یہ دعویٰ بدیہی دعویٰ ہے، اون کی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو، چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

راز خون آلود خویش اے دل مکن بامن بر لب — کیں ورق خام است حرف از وی برون خواہد گذشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا۔

زلفِ او پہلوی خال لب او — گوئی از شہد مگس می راند

نہ رود بر اوج در شبِ تار — تا بزلفِ تو نردبان نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، جب تک تیری زلف کی سیڑھیاں نہ لگائے (چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)

مست صحرا چوں کف دست دہر از لالہ جام — خوش کفِ دستے کہ چندیں جام صہبا برگرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے۔

دیدہ ام شاخِ گلے بر خویش می پیچم کہ کاش
می توانستم بیک دست ایں قدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈال پھولوں سے بھری دیکھی، اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے ہی پیالے لے سکتا،

غلامِ نرگسِ مستم کہ بامداد و پگاہ
قدح بدست گرفتہ ز خواب بر خیزد

گلستاں نسیمِ سحر یافتہ است
صبا غنچہ را خفتہ دریافتہ است

چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب
کہ گویا یکے جامِ زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اُس کو جامِ زر سے تشبیہ دیتے ہیں، اور یہ تشبیہ عام تھی، لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جامِ زر ہاتھ آگیا ہے، ایک خاص لطف پیدا کر دیا، اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں، اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے۔

مکاروی دگریہ مے آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے، کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھکو رونا آتا ہے، اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے، اور اس میں مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اس لئے وہ جانا چاہے گا، تو بارش ہوگی، اس لئے وہ کبھی نہ جا سکے گا۔

می میانِ شیشۂ ساقی نگر
آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ ساغرِ لالہ شراب کرد
درگوشہائے باغ بسے در ناب کرد

فراشِ باغ بارگہ خود بہ باغ زد
وانگہ بر آب خرگہ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب خفت ز فریاد بلبلاں   بنہاد سر بہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی | خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے، غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے، غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا امیر خسرو کا ایجاد ہے اور ان ہی پر خاتمہ بھی ہو گیا۔ متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں، لیکن اس کا دوسرا انداز ہے، وہ اور سلسلہ کی چیز ہے، چنانچہ آگے چل کر اسکی حقیقت کھلے گی،

امیر خسرو کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں مثالوں سے اندازہ ہوگا۔

برخانۂ تو ہمہ روز بامداد بود   کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے، کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا،

زلف تو سیہ چراست یا نا (غالباً)   بسیار در آفتاب گشتہ است (پھرا)

مشبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم   کہ ز ابروی تو چشمم بہ دو محراب افتاد

چشم مست تو کہ دی بر من بیتاب افتاد   تو نیفگندی از آلودگی خواب افتاد

زہر آں چنیں تاریک باشد خانۂ چشم   کہ ہرگز آفتاب من در بیں روزنا نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست   روز روشن چراغ نتواں کرد[1]

می رود گریہ مے آید مرا   ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دل من بہ زلف در رویت شد اسیر چوں نہ گردد   شب ماہتاب دردے کہ بخانۂ در آید

زہے عمر دراز عاشقاں گر   شب ہجراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشق کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے،

---

[1] چراغ کردن، جلانا،

زلف ازاں می بُرد آں شوخ کہ شبہائے غم　　گر شود کوتہ ازاں جا بہم پیوند کنند

یعنی اپنی زلف وہ اس لئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں، تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھا دے۔

راہی است برائے بردن دل　　ابروی تو کز میان کشاد است

یعنی تیرے دونوں ابروؤں کے درمیان میں جو فاصلہ ہے، اسلئے ہے کہ دل لیجانے کیلئے رستہ ہے۔

زلف سر و پا شکستہ زان است　　کز سرو بلندت افتاد است

یک شب ز رخ خویش چراغیم کرم کن　　تا قصہ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم

یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کر دو کہ میں اس کی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں۔

خانۂ چشم من خراب شدہ است　　کہ بہ بنیاد خانہ نم رفتہ است

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکر میان لعل تو کان نمک است　　گرچہ شکر نہ مکان نمک است

آب رُخ تو ملاحت افزود　　گرچہ از آب زیاں نمک است

خواہی ایجانہ برد خواہ بمن باش کہ من　　مردنی نیستم امروز کہ جاناں اینجاست

آئینہ کرد حسن وی از آسمان سوال　　برخاست آفتاب و بہ زانو جواب کرد

یعنی اس کے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا، آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے۔

سر ابروی تو گردم گرہش باز کشائے　　کہ کلاہش نہ بہ اندازہ بازوی کسے است

ہر چند کہ زلف تو سیاہی است جہانگیر　　زیں گونہ پریشاں نتواں کرد سپہ را

بہ سایہ خفتہ بدم من کہ یار آمد و گفت　　چہ خفتۂ کہ رسید آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے۔

ع در دہا دادی و درمانی ہنوز

ع یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم

صنائع | امیر نے اعجاز خسروی میں صنائع وبدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہم کو ڈر تھا کہ جو جال انھوں نے بچھایا، اس میں خود بھی پھنس نہ جائیں لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع وبدائع کو فن بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں مثلاً فرخی وابن المعتز وغیرہ، وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے۔

امیر خسرو اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں، تاہم ان کے صنائع وبدائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں، صنعتِ طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں،

ع در دہا دادی و درمانی ہنوز

زبند دو جہاں آزاد گردم اگر تو ہمنشینِ بندہ باشی
منِ درویش را کشتی بہ غمزہ کرم کردی الٰہی زندہ باشی

گفتیم ناخوش چرا ئی خسروا چوں کنم؟ آں تنگ دل بالا خوش است
بندہ را در غمِ تو نیست خبر ہمہ یارانِ بندہ را خبر است
خرد سالے بہ من کند بیداد اے بزرگانِ شہر داد دہید

عربیت | اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر کو عربی علم ادب میں کمال تھا، اور اس فن کی نادر کتابیں اُن کے حافظہ میں مخزون تھیں، تاہم ان کو اس فن میں دعویٰ نہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجو

اعترافات عجز کے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ اشعار یہ ہیں

ذاب الفواد وسال من عینی الدم
وحکی الدموع کل ما انا اکتم

دل پگھل گیا، اور آنکھ سے خون بہا اور آنسوؤں نے وہ سب کہہ دیا جو میں چھپاتا تھا،

واذا ابحث لدی الوری کرب النوی
تبکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے،

یا عاذل العشاق، دعنی باکیا
ان السکوت علی المحب محرم

او ناصح! تو مجھے رونے دے، چپ رہنا عاشق پر حرام ہے۔

من بات مثلی مھوبید ری خلیلتی
طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے، وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے،

اعجاز خسروی میں عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں، جن سے اُن کی عربیت کا اندازہ ہوسکتا ہے، اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں، لیکن یہ اُس زمانہ کا عام انداز تھا، تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا،

وان انا الا من غزیۃ، ان غوت
غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہرحال قبیلہ غزیہ کا آدمی ہوں، غزیہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہے تو میں بھی

صنائع وبدائع | امیر خسرو نے صنائع وبدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں، اگرچہ کوہ کندن اور کاہ برآوردن ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ اُن کی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے، ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے،

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں، لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اسلئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہوسکتی مثلاً صنعت منقوطہ یعنی عبارت

میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہوتا ہے، امیر نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں، بعض فارسی میں بھی، لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص لکھ نہ سکا امیر خسرو نے ورق کے ورق لکھے، بعض صنائع میں انھوں نے تصرفات کئے، اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں، چنانچہ ہم انہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں،

دو رو یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ نقطوں کے ردو بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور بامعنی ہو، امیر نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں، لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے، اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی بدیدی مرا دی بجائے (کل مکان) زمانے بباشی، بہ یاری بشانی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

کل تو آیا اور تو نے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا، ایک ذرا ٹھہر جا تو دوستی کرنے کے قابل ہے

لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں۔

رشیدی بدیدی مرادی نجاتی ادمانی بیابسِ تباری نسائی

تو میرا ہدایت یافتہ ہے بے نظیر ہے میری مراد ہے میری نجات ہے، مجھکو اس بات نے نا امید کیا ہے کہ میری عورتیں باہم لڑتی ہیں،

قلب اللسانین، بہت سے اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں، لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے مثلاً

بسی باکامرانی در جہاں باش

می باش بہ کار شادمانی

با سی یار ما کہ کار می کنیم ہم

دوست ما یاد منی بہ یاری ما آئی

بکن داد و بکشود کامراں باش

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے،

وصل الحرفین، یہ وہ صنعت ہے کہ جب نثر الفاظ عبارت میں آئیں، ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے، بلکہ دو دو تین تین حرف کا لفظ ہو، مثلاً

چاکر خاصہ، حاجی نشر ثانی، سرخدمت، بر پایت می مالد، دمی گوید، کہ بدیں جانب خاطر ما با فرحت قرین می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما نامہ فرمایند تا ہر خوشی کہ برسات فرخی کامل باشد۔

یہ اُس صنعت کا نقیض ہے جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً

دَر دُور دادآور دُر دوار داراى در مارى دوّارِ ذات داور دوراں را الخ

امیر نے اسی صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

اربعۃ الاحرف، اس صنعت پر امیر کو بہت ناز ہے، کئی کئی سطروں کی باہمی عبارت لکھی ہے، اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف، ہ، واؤ، ے کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے، یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں۔

لیکن جو عبارت لکھی ہے، وہ بالکل سہل معلوم ہوتی ہے اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنۃ والشفاہ، اس صنعت پر اور بھی اُن کو ناز ہے، اسی میں ایسے الفاظ جمع کیے ہیں کہ سطریں کی سطریں پڑھتے جاؤ، لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی، صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمۃ اللفظ، یہ صنعت بھی خاص اُن کی ایجاد ہے، اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے اس کے بعد کا لفظ، دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے، مثلاً

سودا اے رنجِ تو کشت مارا

یہ فارسی مصرع ہے لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو مارا ہوگا اس لیے مصرع کا اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے، امیر نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے،

محتمل المعانی، ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے سات معنی ہیں اور ہر معنی وہاں مراد لیے جا سکتے ہیں،

موقوف الآخر، ایک رباعی لکھی ہے، جس کا ہر قافیہ دوسرے مصرع کے آغاز کا محتاج رہتا ہے، مثلاً

درحسن ترا، کسے نماند الّا   خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند و پای تو بوسد، امّا   ہیچ نوبت او چو پا بوسد، تا

انہی صنعتوں اور بیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں، اگر کسی صاحب کو امیر خسرو سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں۔

سلمان ساوجی

(وفات ۷۶۹ھ یا ۷۷۸ھ)

عراقِ عجم میں ساوہ ایک مشہور صوبہ تھا، صاحبِ آتشکدہ لکھتے ہیں کہ "اب صرف چند قصبے باقی رہ گئے ہیں" سلمان یہیں کے رہنے والے تھے، عربی میں نسبت کے وقت "ہ" "ج" سے بدل جاتی ہے اس لئے ساوجی کہلاتے ہیں، ان کا خاندان ہمیشہ سے معزز چلا آتا تھا اور سلاطین وقت اُن کا بہت احترام کرتے تھے، سلمان کے والد جن کا نام خواجہ علاء الدین محمد تھا، دربار شاہی میں ملازم تھے، سلمان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی حیثیت سے ہوئی تھی، چنانچہ دفتر کے کاروبار اور علم سیاق میں نہایت کمال رکھتے تھے، اس زمانہ میں جو طوائف الملوک حکومتیں جا بجا قائم ہوگئی تھیں، اُن میں ایک جلایر کا خاندان تھا، جس کا پایۂ تخت بغداد تھا، اس خاندان نے ۵۰ برس تک حکومت کی اور چار شخص مسندِ حکومت پر بیٹھے، اس سلسلہ کا پہلا فرمان روا حسن ایلکانی تھا، حسن ایلکانی کے فرزند سلطان اویس جلایر نے بڑا جاہ اور اقتدار پیدا کیا، سنہ ۷۵۶ھ میں آذربائجان، اران، موغان، شروان، موصل وغیرہ فتح کر کے اپنے حدودِ حکومت میں داخل کر لئے ۱۹ برس تک بڑے عظمت و اقتدار کے ساتھ حکومت کی، مختلف علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا، تصویر ایسی عمدہ کھینچتا تھا کہ بڑے بڑے مصور دنگ رہ جاتے تھے، خواجہ عبدالحی جو مشہور مصور گذرا ہے، اسی کا تربیت یافتہ تھا، علم موسیقی میں اکثر چیزیں اس کی ایجاد ہیں، ان باتوں کے سوا حسن و جمال کا یہ حال تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو راستہ تماشائیوں سے رک جاتا تھا، سنہ ۷۷۶ھ میں وفات پائی[1] خواجہ سلمان انہی دونوں کے دربار کے ملک الشعراء تھے،

---

[1] مجمع الفصحا و تذکرہ دولت شاہ،

خواجہ سلمآن کی ابتدائی تقریب کا یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے حسن ایلکانی کی نیابت میں ملک کا شہرہ سنکر بغداد کا قصد کیا، اور دربار میں پہونچے، ایک دن حسن تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا، سلمان بھی اس موقع پر موجود تھے، برجستہ یہ اشعار کہہ کر پیش کئے۔

چو در بار چاچی کماں رفت شاہ ۔۔۔ تو گفتی کہ در برج قوس است ماہ
دو زاغ کماں با عقاب سہ پر ۔۔۔ بدیدم بیک گوشہ آوردہ سر
نہادند سر بر سر گوش شاہ ۔۔۔ ندانم چہ گفتند در ہوش شاہ
چو از شست بکشادہ خسرو گرہ ۔۔۔ بر آمد ز ہر گوشہ آواز زہ
شہا! تیر در بند تدبیر تست ۔۔۔ سعادت دواں در پی تیر تست
بعہدت ز کس نالہ بر نخاست ۔۔۔ بغیر از کماں کو بنالد رواست
کہ در عہد سلطان صاحبقراں ۔۔۔ نکرد است کس ۔۔۔ جز بہ کمال

حسن نے سلمآن کی غیر معمولی قادر الکلامی دیکھ کر مقربین خاص میں داخل کیا۔

سلطان حسن کی حرم دلشاد خاتون نہایت قابل اور لائق عورت تھی، سلطان برائے نام بادشاہ تھا، سلطنت کا نظم و نسق دلشاد خاتون کے ہاتھ میں تھا، وہ شعرائے سخن کی بڑی قدر دان تھی، اس بنا پر سلمآن کی نہایت قدردانی کرتی تھی، سلمان نے بھی اس کی مدح میں جی کھول کر زور طبع دکھایا ہے،

سلطان اویس کو شاعری کے ساتھ خاص مذاق تھا، خود شعر کہتا تھا، اور سلمآن کو دکھاتا تھا، اس بنا پر سلمان نے اس کے دربار میں نہایت تقرب حاصل کیا،

ایک دفعہ سلمان رات کے وقت سلطان اویس کی مجلس عیش میں شریک تھے جلسہ ختم ہو چکا تو سلمان اٹھے، سلطان نے ملازم کو ساتھ کر دیا کہ روشنی دکھانے کیلئے

شمع ساتھ لیجائے، گھر پر پہنچے تو ملازم شمع وہیں چھوڑ آیا، صبح کو شمع لینے گیا تو خواجہ صاحب اس بنا پر گھبرائے کہ شمع کے ساتھ طلائی تھالی بھی تھی، وہ ہاتھ سے جاتی رہے گی اسی وقت یہ شعر لکھ کر ملازم کو دیا کہ سلطان کی خدمت میں پیش کرنا،

شمع خود سوخت بہ زاری شب دوشین و امروز ۔۔۔ گر لگن می طلبد شاہ ز من می سوزم

سلطان نے ہنس کر کہا کہ شاعر سے کوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے[1].

سلطان جب بہت ضعیف ہو گئے تو ملازمت سے استعفا دینا چاہا اور مسلسل چار[2] قطعے لکھ کر پیش کئے۔

پادشاہا! بندہ در حضرت بسی عمر گذشت ۔۔۔ انبساطی می نماید می نماید بر امید رحمتت
قرب چہل سال است تا سلطان شرق و غرب را ۔۔۔ طبع سلطان می کند در گوش در مدحتت
مدتنا حضرت عہد جوانی گشت صرف ۔۔۔ نوبت پیری رسید اکنوں بامر حضرتت
گوشۂ خواہم گرفتن تا اگر عمرے بود ۔۔۔ چند روزے بگذرانم در دعاے دولتت
علت پیری دو رو با ضعف جسم و چشم ۔۔۔ می برد در دسر من بندہ را از خدمتت
گفتہ ام رباب خود فصلے دو سہ آنرا جواب ۔۔۔ چشم دارد بندہ از درگاہ گردوں حشمتت

قطعۂ دوم

بود آں شست کہ چوں نیت عزلت آرد ۔۔۔ بندہ زیں دائرۂ جمع جدا خواہد بود
مدتے مالک ملک شعرا بود بحق ۔۔۔ زیں زماں خادم جمع فقرا خواہد بود

---

[1] دولت شاہ

پیش ازیں در پے مخلوق بسر گردی گردید | بعد ازیں بر در معبود سپا خواہد بود
بندہ تا زندہ بود وجہ معاش بندہ | ہیچ شک نیست کز احسانِ شما خواہد بود
لیک دارم طمع آں کہ معیّن باشد | کہ مرا وجہ معیشت ز کجا خواہد بود

قطعۂ سیوم

دیگر آن است کہ محبوبِ جہاں مقری شاہ | آمد از بندگی[1] شاہ کہ مے فرماید
رو بگو بندۂ دیرینۂ ما سلطاں را | کہ بخواہ از کرم ہر چہ ترا می باید
بندہ بر حسبِ اشارت طلبی کردم و شاہ | داشت مبذول جہاں کز کرم شاہ آید
وعدہ دیں است ز دین من اگر زانچہ کنند | ذمۂ ہمتِ تو و شاہ بری مے شاید

قطعۂ چہارم

دیگر از خرچ ترہ و خل بکش قرضے چند | سبب و قرض است کہ قرض غربا باز دہد
بندہ را غیر در شاہ در دیگر نیست | قرض باید کہ ز انعام شما باز دہد
وجہ ایں قرض کہ از منِ غربا می خواہند | گر نخواہد ز تو سلطاں ز کجا باز دہد

سلطان نے فی البدیہہ پہلے قطعہ پہ یہ شعر لکھا،

ہر چہ تا غایت بنام او مقرر بودہ است | ہمچناں باشد بنام او مقرر ہمچناں

دوسرے قطعہ پہ یہ لکھا،

وہ ایں کہ در حدود سے است | بہ ہندش کہ التماس وے است

---

[1] بندگی کا لفظ اس زمانہ میں اس طرح بولتے تھے جس طرح آجکل بادشاہ کے لئے "ہز مجسٹی" کہتے ہیں۔

غرض جاگیر اور تنخواہ کی بحالی کے ساتھ قرض بھی ادا کر دیا گیا۔[۱]

سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جب تک زندہ رہے ہر قسم کے تعلقات سے آزاد رہے، حسبِ روایت دولت شاہ ۷۶۹ھ میں وفات پائی، لیکن مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے دیوان سلمان کا ایک نسخہ ۷۹۱ھ کا لکھا ہوا دیکھا اس کے خاتمہ میں ایک قطعہ تھا، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ قطعہ سلمان کا معاصر ہے، قطعہ یہ ہے۔

محل آیتِ اعجازِ پارسی سلمان	کہ کرد ناطقہ پیش وش بہ عجز اقرار
ندید بہ سرِ شاخ گلِ سخن اصلا	بہار طبع چو او عندلیب خوش گفتار
نماز شام دو شنبہ بیاز صفر بودہ	کہ نقد عمر بہ یک دم چو صبح کرد نثار
بساط دار قرار بست سال تاریخش	چو کرد میل بہ سوئے بساط دار قرار

اس سے ۷۷۸ نکلتے ہیں،

ناصر بخاری اس زمانہ میں مشہور شاعر تھے، اور درویشانہ وضع رکھتے تھے حج کو جاتے ہوئے بغداد میں آئے، خواجہ سلمان کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی، ان کو بھی ملنے کا شوق پیدا ہوا، ایک دن سلمان دجلہ کے کنارے عالمِ آب کی سیر کر رہے تھے، ناصر وہیں پہنچے، سلمان نے مزاج پرسی کے بعد نام و نشان پوچھا، ناصر نے کہا شاعر ہوں سلمان نے فی البدیہہ یہ مصرع پڑھا،

ع دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ است

ناصر نے برجستہ دوسرا مصرعہ پڑھا۔

ع پائے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ است[۲]

---

[۱] یہ تمام تفصیل خزانہ عامرہ میں ہے [۲] دولت شاہ تذکرہ ناصر بخاری،

سلمان نے گلے سے لگا لیا، اور کئی دن تک مہمان رکھا، ناصر باوجود کمال استادی کے سلمان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے،

عُبید زاکانی ہجو گویوں کا پیشوا، اسی زمانے میں تھا، ایک دفعہ خواجہ سلمان سفر میں امیرانہ ساز و سامان کے ساتھ ایک چشمہ کے کنارے خیمہ زن تھے، اتفاق سے عبید زاکانی کہیں سے آ نکلا، سلمان نے پوچھا کدھر سے آنا ہوا، عبید نے کہا قزوین سے، سلمان نے کہا سلمان کا کلام کچھ یاد ہو تو سناؤ، عبید نے یہ شعر پڑھے،

من خراباتیم و بادہ پرست　　در خرابات مغاں عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش　　می برندم چو قدح دست بدست

ساتھ ہی کہا لیکن سلمان بڑے رتبہ کا شخص ہے، یہ شعر اس کے نہیں ہو سکتے، عجب نہیں کہ ان کی بیوی کا کلام ہو، سلمان بہت برہم ہوئے لیکن قیاس سے سمجھا کہ عبید ہے، قسم دیکر پوچھا، عبید نے اقرار کیا اور کہا کہ تم بے دیکھے لوگوں کی ہجویں کرتے ہو، یہ زیبا نہیں کہ میں بذاتِ خاص اس غرض سے آیا تھا کہ تم کو ہجو گوئی کا مزہ چکھاؤں، تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے قصداً چھوڑ دیا، سلمان نے شکر گزاری کی، خود گھوڑے پر سوار کرایا۔ نقدی اور کپڑے دیئے، اس پر بھی ہمیشہ عبید کی ہجو گوئی سے ڈرتے رہے[1]

کلام پر رائے | سلمان کے کمال شاعری کا تمام اساتذہ نے تعریف کیا ہے، خواجہ حافظ معاصر تھے، تاہم کہتے ہیں،

سرآمد فضلائے زمانہ دانی کیست　　ز راہِ صدق و یقین نے ز راہِ کذب و گماں
شہنشاہ فضلا بادشاہ ملکِ سخن　　جمالِ ملت و دیں خواجۂ جہاں سلماں

---

[1] دولت شاہ حالات عبید زاکانی،

سلمان نے شاعری کی عمارت کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی داغ بیل پر قائم کی، اکثر قصائد ان ہی دونوں کے جواب میں اور اسی طرز میں لکھے ہیں، مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ سلمان کے اکثر مضامین، اساتذۂ قدیم خصوصاً کمال اسمٰعیل سے ماخوذ ہیں، لیکن سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں، اور اس کی یہ مثال ہے۔

معنیِ نیک بود شاہدِ پاکیزہ بدن　　　کہ بہر چند جامہ دگرگوں پوشند
کسوتِ عار بود باز پسیں خلعتِ او　　　کہ نہ در خوبیش از پیشتر افزوں پوشند
ہنر است اینکہ کہن خرقۂ پشمیں ز برش　　　بدر آرند و در اطلس و اکسوں پوشند

شاعری میں سلمان کا ایک خاص درجہ ہے، یعنی وہ قدما اور متوسطین میں برزخ ہیں، ان کا کلام قدما کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے، انھوں نے کمال اسمٰعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے، اور اس میں ایجادِ مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے، مضمون بندی جو متوسطین اور متاخرین کا مابہ الامتیاز جوہر ہے، گو کمال نے شروع کی، لیکن سلمان نے کمال کو پہنچا دیا۔

سلمان نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، مثنوی جمشید و خورشید ان کی مشہور مثنوی ہے، اس کا انداز اشعار ذیل سے معلوم ہوگا۔

شگوفہ چو نازک تنے سیم بر　　　ز صندوقِ چوبیں بر آوردہ سر
بنفشہ چو مشکیں سرِ زلفِ یار　　　بریدہ ز بار خمِ دوش روزگار
بگلبن کہ سوسن پریزادہ است　　　زباں آورے خوب و آزادہ است
شنیدم کہ پروانہ با بلبلے　　　ہمی کرد در عشقِ گل غلغلے
ہمی گفت کیں بانگ و فریاد چیست　　　ز بیدادِ معشوق ایں داد چیست
ز من عاشقی باید آموختن　　　کہ ہرگز نہ نالم از سوختن

بہ روز من دحال من کس مباد — کہ یارم رود پیش چشم بہ باد
بباید بداں زندہ بگریستن — کہ بے یار خود بایدش زیستن

سلمان نے اگرچہ مثنوی، قصیدہ، غزل سب کچھ لکھا ہے لیکن ان کی شاعری کا اصلی میدان قصیدہ گوئی ہے، ان کے قصائد کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زبان کی صفائی اور روانی کے ساتھ ترکیبوں میں وہ چستی جو ان سے پہلے نہ تھی اور جو خاص متوسطین شعراء کا انداز ہے، مثلاً

خندۂ زد دہنت تنگ شکر پیدا کرد — سخنی گفت لبت لولوئے تر پیدا کرد
بود نایافت میان تو لیکن کمرت — حیث پر بست میارا و بہ زر پیدا کرد
پردہ از چہرہ برانداز کہ آن زلف سیاہ — در سپیدی عذار تو اثر پیدا کرد

باد نوروز نسیم گل رعنا آورد — گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد
شاخ را باغ بہ نقش دم طاؤس نگاشت — غنچہ را باد بہ شکل سر بیضا (طوطا) آورد
لالہ از دامن کوہ آتش موسی بنمود — شاخ بیروں ز گریباں ید بیضا آورد
انبے حسن گل، بلبل شیریں گفتار — نغمہ با ربد و صورت نکیسا آورد

سرو را باد صبا منصب بالا بخشد — لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد
صبحگاہے کہ صبا مجمرہ گرداں باشد — گل فرو کردہ بداں مجمرۂ داماں باشد
جامۂ سرو ز استبرق و سندس بافند — کمر کوہ ز پیروزہ و مرجاں باشد
می کند باد صبا طفل چمن را در خواب — ورنہ مہد شجر ش بہر چہ جنباں باشد
آب در رود ز نواہائے تر و تازہ زند — مرغ بر شاخ سحر ساختہ الحاں باشد

۲۔ دقیق اور نازک مضمون آفرینی جو متوسطین اور متاخرین کا کارنامۂ فخر ہے،

چند مثالیں ذیل میں درج ہیں،[1]

دُرجِ درِ عقیق لبت[2] نقدِ جاں نہاد　　　　جنس نفیس بود بہ جائے نہاں نہاد

قفلے ز لعل بر درِ آں درج زد لبت　　　　خالت ز عنبر آمد و مہرے برآں نہاد

باریک تر ز موئے کمرت را دقیقہ ئیست　　　　ناگاہ در دل آمد ما شمس میاں نہاد

دہن و دنداں و لب و خال کی تشبیہ

یعنی کمر بند کے خیال میں ایک مضمون یاد آیا ہے جو بال سے بھی باریک تھا کمر بند نے اس کا نام کمر رکھ دیا، مطلب یہ ہے کہ معشوق کی کمر در حقیقت ایک باریک خیال ہے،

بعد ازیں از گرہ زلفِ مغاں، کن تسبیح　　　　پس ازیں از خمِ ابروی بتاں کن محراب

خوش برآ ہمچو حباب از مئی گلگون و منہ　　　　ریگ بنیاد بریں گنبدِ گردوں چوں حباب

دوران کی تشبیہ

مدتے گردشِ ایں دائرہ ما را از ہم　　　　ہمچو پرکار جدا کرد و بہم باز آورد

غنچہ را بیش دہان تو صبا خنداں یافت　　　　آں چناں بر دہنش زد کہ دہن پُر خوں شد

پا ازیں دائرہ بیروں نہ نہم مکسر مو　　　　گو سراپائے چو پرکار کنندم بدو نیم

دامن از من مکش ای سرو کہ چوں آب روان　　　　من سری در قدمت ے نہم و می گذرم

[illegible] کی تشبیہ

۲۔ تخلص یعنی گریز میں نئے نئے پیرائے پیدا کئے، ایک قصیدہ ہے جس کی ردیف دست ہے اور قافیے نہار، نگار، بہار، اس میں گریز کا شعر ہے۔

سودائی است ورنہ چرا می کند، دراز　　　　زلفت بہ عہد معدلت شہریار دست

تیری زلف سودائی ہے ورنہ بادشاہ کے زمانہ میں دست درازی کیوں کرتی،

---

[1] اوپر جو اشعار گذرے ان کو مضمون بندی کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہیے [2] یعنی تیرے ہونٹوں نے عاشق کی نقدِ جان کو موتی کے ڈبہ (دہن) میں رکھا، اسلئے کہ وہ نفیس چیز تھی اور نفیس چیز کو ایسی ہی مخفی جگہ رکھتے ہیں، پھر ہونٹوں نے ڈبہ پر یاقوت کا قفل لگا دیا اور تل نے آکر عنبر کی مہر کر دی۔

ایک قصیدہ میں تشبیب کے بعد کہتے ہیں،

بعد ازیں غم مخور اے دل کہ غمِ امروز ہمہ — روزیِ دشمنِ دارائے مظفر شدہ است

اب اے دل غم نہ کھا کیونکہ اب تو غم، مظفر شاہ کے دشمن کی خوراک بن گیا ہے،

عیش اور رقص و سرود کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں،

مطربا راہِ[1] طرب خوش بزن امروز کہ نیست — جز تو در عہدِ شہنشاہِ جہاں راہ زنے

نیست پیدا، دہنت بر رخ، و در دولتِ شاہ — فتنہ آں بہ کہ بہمہ وجہ کہ پنہاں باشد

دورِ مستی است دریں دور نہ زیبد کہ بود — بجز از بختِ خداوندِ جہاں کس بیدار

سایۂ زلفِ تو بر چشمۂ خورشید فتاد — خمِ زلفِ تو مگر چترِ شہِ دادگر است

بہ مشکل مشکل ردیفیں ایجاد کیں اور ان میں اسی روانی اور صفائی کے ساتھ کہتے جاتے ہیں گویا معمولی ردیفیں ہیں، اس کے ساتھ ہر جگہ ردیف نہایت خوبی سے نمایاں ہوتی ہے مثلاً

منم امروز بلائے شبِ ہجراں بر سر — کردہ در کارِ تو چوں شمع دل و جاں بر سر

دست آنم نہ کہ در دامنت آویزم دست — تا مگر گسترم لطفِ تو داماں بر سر

سرو پای تو می میرد و مرغانِ چمن — می کنندش ہمہ شب نالہ و افغاں بر سر

ماہِ تابانِ تو یا شبِ مشکیں بر دوش — سرو رعنائے تو دارد گلِ خنداں بر سر

آفتابِ تو اگر سایہ ز من باز گرفت — باز یابند مرا سایۂ سلطاں بر سر

مدح کے بعد فخریہ کہتے ہیں،

شعرم از تربیتِ لطفِ تو جائی برسید — کہ نہندش ہمہ اشرافِ خراساں بر سر

دعائیہ ملاحظہ ہو،

---

[1] راہ کے معنی راگنی کے بھی ہیں اور رستہ کے بھی، پہلے مصرع میں پہلے معنی لئے ہیں اور دوسرے میں دوسرے معنی،

تا نشد حضرو گل تخت زمرد در باغ　　تاج یاقوت نهد لالهٔ نعماں بر سر
تیر باراں کند از روے ہوا قوس قزح　　ہر دم آرد، سپر لعل، گلستاں بر سر
شہر دو دنہ بخت تو چناں مستمر باد　　کہ فلک را نگند سایۂ احساں بر سر

اسی طرح دست، پاے، رو وغیرہ ردیفوں میں قصیدے لکھے ہیں،

قطعات | قصیدہ کی افتاد ایسی پڑ گئی تھی کہ اس میں بجز معشوق اور ممدوح کی مداحی کے اور کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، جو شعرار اور اور خیالات ادا کرنا چاہتے تھے، وہ قطعات کے ذریعے سے ادا کرتے تھے،

سلمان نے نہایت کثرت سے قطعات لکھے ہیں، اور ان میں ہر قسم کے عجیب غریب مضامین ادا کئے ہیں، افسوس ہے کہ سلمان کا جو دیوان بمبئی میں چھپا ہے، اس میں یہی قطعات نہیں ہیں، جو دیوان کی جان ہے، ہمارے پاس جو قلمی مجموعہ ہے، اس میں سے بعض نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

بادشاہ نے سلمان کو ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا عنایت کیا تھا، سلمان نے واپس کر دیا کہ دوسرے رنگ کا گھوڑا مرحمت ہو، داروغۂ اصطبل نے وہ بھی رکھ لیا، اس پر کہتے ہیں۔

شاہا مرا بے اسپے موعود کردہ بودی　　در قول بادشاہاں قیلے دگر نباشد
اسپے سیاہ و پیرم دادند و من برآنم　　کاندر جہاں سیاہے زاں پیر تر نباشد
آں اسپ باز دادم، تا دیگرے ستانم　　بر صورتے کہ کس را زیں سر خبر نباشد
اسپ سیہ بدادم، لنگے دگر ندادند　　آری "پس از سیاہی رنگے دگر نباشد"

ایک اور قطعہ میں گھوڑے کی ہجو کی ہے،

شاہا امید بود کہ خواہم بدو نشست　　بر مرکبے بلند وجواں در رواں نشست

اسپیم پیر و کاہل و کوتہ ہمی دہند — اسپے نہ آں چناں کہ تواتم بر آں نشست
چوں کلک مرکبے سبب سست و لاغر است — جہلِ مرکب است بر اسپے چناں نشست
از بندہ مہتر است بسی سال، راستی — گستاخی است بر زبر مہتراں نشست

آنکھوں میں آشوب کی وجہ سے دربار میں جانا بند ہو گیا تھا، اس کی معذرت میں ایک قطعہ لکھا ہے،

خسروا خاکِ درگہِ تو مرا است — از غبار زرد ے سنیکو تر
لیک در عین حالتے کہ مرا است — غیبتم از حضور نیکو تر
حالِ چشمم بد است، دور از تو — چشمِ بد، از تو دور نیکو تر

بدن پر کپڑے نہیں رہے تھے، بادشاہ کو قطعہ لکھا،

ای ز ما مستغنی و از امثالِ ما — بر شما احوالِ ما پوشیدہ نیست
بر تنم پوشیدنی این ست و بس — بندہ را ہیچ از شما پوشیدہ نیست

بادشاہ نے ملبوس خاص بدن سے اتار کر بھیجا اور یہ شعر لکھا

ہر چند ترا، جامہ ما پوشیدن — عیب است ولیکن این عیب بپوش

درد پا کی وجہ سے دربار میں نہ جا سکتے تھے، اس کی عذر خواہی کرتے ہیں۔

بہر استقبالِ شاہ از فرق و سر، کردم قدم — خواستم تا رو بہ درگاہ ہمایوں آورم
درد پایم گشت ازاں مانع کہ آرم درد سر — من کہ درد پای دارم درد سر چوں آورم

سلمان کی بدعات | سلمان سب سے پہلے شخص ہیں جس نے صنعت ایہام کو نہایت کثرت سے برتا، اس میں اکثر لطیف اور نئے نئے پیرائے پیدا کئے، مثلاً

با قد تو صنوبر در چشم من نیاید — او کیست تا قدت را قائم مقام باشد
کی تواند دلم از موی میانِ تو گذشت — کہ شبِ تیرہ و تاریک ہمی پکرست

چشم سرمست تو عین بلا می بینم　　　لیکن ابروے تو چیزیست کہ بالاے بلاست

فتنہ در دور تو بیمار و ضعیف افتادست　　　آں چناں نیست کہ تا حشر تواند برخاست

با چنیں عارضہ و ضعف، تمنائے نجات　　　دارم اما ہمہ موقوف اشارات شفاست

سرو را باد صبا منصب بالا بخشید　　　لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

در بست با دلم دہن تنگ او بہ ہیچ　　　او ایں چنیں مبالغہ بسیار می کند

نیست سودائے سر زلف تو کار ہمہ کس　　　کاں طریقے است خم اندر خم و دل گیر و دراز

لیکن اکثر اس قدر بے اعتدالی برتی کہ ضلع جگت کی حد تک نوبت پہنچ گئی، سینکڑوں اشعار ہیں جن میں صرف رعایت لفظی سے کام لیا ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعت مقبول عام نہ ہوئی ورنہ ایران میں بھی بہت سے امانت پیدا ہو جاتے۔

<u>غزلیں</u> | سلمان کی غزلیں چنداں مقبول نہیں ہوئیں، ان سے پہلے سعدی کا رنگ عالم کو مسخر کر چکا تھا، اس رنگ میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، اس لئے مضمون آفرینی شروع کی لیکن لوگوں کے کانوں میں سعدی کی لے گونج رہی تھی، اس لئے ان کی آواز خالی گئی، سعدی ہی کا رنگ جب خواجہ حافظ نے اختیار کیا، اور اس شراب کو اور تیز کر دیا تو ع حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار، نمونہ کے طور پر ہم سلمان کی ایک دو غزل اور متفرق اشعار نقل کرتے ہیں۔

بہ سر گوشۂ تو سوگند کہ تا سر دارم　　　نیست ممکن کہ من از حکم تو سر بر دارم

اے کہ در خواب غروری خبرت نیست کہ من　　　ہر شب از خاک درت بالش و بستر دارم

ساغرم پر می و می در سر و سر در کف دست　　　تو چہ دانی کہ من امروز چہ در سر دارم

گوشۂ در قدم من گہر انداز بہ چشم　　　وینکہ از بہر قدمہائے تو گوہر دارم

دل برد دلبر و در دامِ بلاش اندازد　　دل ما برد، کنون تا بہ کجاش اندازد

چشمِ فتانِ تو ہر جا کہ بلا انگیزد　　ای بسا کس کہ دراں عرصہ بلاش اندازد

ہر کجا مرغِ دلے بال کشاید، الحال　　بہ کمان خانۂ ابرو، زہو اشش اندازد

خوش کمندی است سرِ زلفِ شکن پر شکنش　　وہ چہ خوش باشد اگر بخت بہ پاش اندازد

عاقل آن است کہ در پای تو اندازد سر　　پیشتر زاں کہ فراقِ تو ز پاش اندازد

بوی گیسوی تو ہر جا کہ جگر سوختہ ایست　　در پے قافلۂ باد صباش اندازد

ہر کرا درد ببیند اخت دوا چارہ کند　　کہ کند چارۂ سلمان چو دواش اندازد

یک شب خیالِ چشمِ تو دیدیم ما بخواب　　زاں شب دگر بہ چشم ندیدیم خواب را

غمزہ ات دل می برد چشم توام خون می خورد　　روز و شب آں در شکار این در شراب افتادہ است

زاہد ہم توبہ ز روی تو زہے روی　　ہیچش ز خدا شرم و ز روی تو حیا نیست

من خراباتیم و بادہ پرست　　در خراباتِ مغاں عاشق و مست

می کشندم چو سبو دوش بدوش　　می برندم چو قدح دست بدست

ظاہر نمی شود اثر صبح گوئیا　　دود دلم دریچۂ خاور گرفتہ است

خواجہ حافظ شیرازیؒ

تاریخ شاعری کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ افسوسناک نہیں ہوسکتا کہ خواجہ حافظ کے حالاتِ زندگی اس قدر کم معلوم ہیں کہ تشنگانِ ذوق کے لب بھی تر نہیں ہوسکتے، اس پایہ کا شاعر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کثرت اور تفصیل سے اس کی سوانحعمریاں لکھی جاتیں کہ اس کی تصویر کا ایک ایک خدوخال آنکھوں کے سامنے آجاتا لیکن ہمارے تمام تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ان سب کو جمع کردیا جائے تب بھی ان کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہو کر نہیں نظر آتا، جس قدر تذکرے ہیں سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں، اور وہی چند واقعات ہیں جن کو باختلاف الفاظ سب نقل کرتے آتے ہیں، ان سب میں عبدالنبی فخر الزمانی نے اپنے تذکرہ میخانہ میں جو جہانگیر کے عہد میں ۱۰۳۶ھ میں لکھا گیا، ابتدائی حالات اوروں کی نسبت اچھے بہم پہنچائے ہیں، حبیب السیر میں جستہ جستہ کچھ واقعات ملتے ہیں، خود حافظ کے کلام میں جا بجا واقعات کے اشارے ہیں ان سب کو ترتیب دیکر اُن کی زندگی کی تصویر کھینچتا ہوں، لیکن دراصل یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ سچ یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ محض چند لکیریں ہیں۔

نام ونسب خواجہ صاحب کے دادا، اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے اتابکانِ شیراز کے زمانہ میں شیراز میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی، خواجہ صاحب کے والد کا نام بہاؤ الدین تھا، انھوں نے یہاں تجارت شروع کی اور کاروبار کو اس قدر ترقی دی کہ دولت مندوں میں ان کا شمار ہونے لگا، بہاؤ الدین نے جب انتقال کیا

تو تین بیٹے چھوڑے، ان کو اگرچہ باپ سے بہت بڑا ترکہ ملا تھا، لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ نہ تھا، چند روز میں باپ کی کمائی سب اڑ گئی، بیٹے پریشان ہو کر کہیں کے کہیں نکل گئے، لیکن خواجہ صاحب کمسنی کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ شیراز ہی میں رہ گئے، گھر میں فاقے ہونے لگے تو ان کی ماں نے ان کو محلہ کے ایک آدمی کے حوالہ کر دیا، کہ اپنی خدمت میں رکھے اور کھانے پینے کی کفالت کرے، لیکن یہ شخص بد اطوار تھا، خواجہ سن شعور کو پہنچے تو اس کی صحبت ناگوار ہوئی، چنانچہ اس سے قطع تعلق کر کے خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا، آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک خمیر گوندھتے، گھر کے پاس ہی ایک مکتب خانہ تھا، محلے کے سب لڑکے اس میں پڑھتے تھے، خواجہ صاحب اکثر ادھر سے نکلتے تو دل میں تعلیم کی تحریک پیدا ہوتی، رفتہ رفتہ شوق اس قدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہو گئے، خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک معلم کو دیتے، بقیہ خیرات کرتے، مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا، معمولی سواد خوانی کی بھی لیاقت حاصل کی، اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، محلے میں ایک بزاز رہتا تھا، وہ سخن سنج اور موزوں طبع تھا، اس مناسبت سے ارباب ذوق بھی اس کی دوکان پر آ بیٹھتے تھے، اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے، خواجہ صاحب پر بھی اس مجمع کا اثر ہوا، چنانچہ شاعری شروع کی، لیکن طبیعت موزوں نہ تھی، بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا، رفتہ رفتہ ان کی لغو گوئی کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی، لوگ تفریح کے لئے ان کو صحبتوں میں بلاتے اور لطف اٹھاتے، دو سال تک یہی حالت رہی، لوگوں کا استہزا اس حد سے بڑھا تو ان کو بھی احساس ہوا، ایک دن نہایت رنجیدہ ہوئے اور بابا کوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے، رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ

کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے، نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر علیہ السلام ہیں، صبح کو اٹھے تو یہ غزل لکھی،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ۔۔۔ واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

شہر میں آئے تو لوگوں نے حسب معمول شعر پڑھنے کی فرمایش کی، انھوں نے وہی غزل پڑھی، سب کو حیرت ہوئی اور سمجھے کہ کسی سے یہ غزل لکھوائی ہے، امتحان کے لیے طرح دی، انھوں نے طرح میں بھی عمدہ غزل لکھی، اسی وقت گھر گھر چرچا پھیل گیا،

یہ تمام واقعات عبد النبی نے میخانہ میں لکھے ہیں، اس میں اگرچہ خوش اعتقادی اور وہم پرستی نے بعض باتیں بڑھا دی ہیں، یا اصل واقعات کی صورت بدل دی ہے، تاہم بہت کچھ اصلی واقعات بھی ہیں۔

(خواجہ صاحب کے کمالات اور شاعری کا چرچا عام ہوا، تو دور دور سے سلاطین اور امراء نے ان کے بلانے کے لیے خطوط بھیجے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں شیراز میں متعدد حکومتیں قائم ہوئیں اور حسن اتفاق یہ کہ فرماں روا عموماً خود صاحب علم و فضل اور علما اور شعراء کے نہایت قدر داں تھے)

غازان خان (چنگیز خاں کا پوتا) کے زمانہ میں غازان خان کی طرف سے محمد شاہ انجو فارس اور شیراز کا حکمراں مقرر ہو کر آیا تھا، اس کے خاندان میں سے (شاہ ابو اسحاق خواجہ حافظ کے زمانہ میں تھا، وہ نہایت قابل اور فاضل تھا، خود شاعر اور شعراء کا مربی اور قدر داں تھا) اس کے ساتھ نہایت عیش پرور اور لہو و لعب کا دلدادہ تھا، اس بنا پر اگرچہ ملکی انتظامات بے اصول تھے، لیکن گھر گھر عیش و نشاط کے چرچے تھے، اور شیراز باغ ارم بنا ہوا تھا (خواجہ حافظ کی مستانہ غزلوں میں اس دور کا اثر شامل ہے)

(شاہ ابو اسحٰق کی عیش پسندی حد سے بڑھ گئی تو ۷۵۴ھ میں محمد مظفر نے اس پر لشکر کشی کی) فوجیں شہر پناہ کے دامن میں آگئیں، لیکن ابو اسحٰق کو کوئی شخص خبر نہیں کر سکتا تھا، امین الدین نے کہ مقرب خاص تھا، ابو اسحٰق سے کہا کہ جوش بہار نے شہر کو چمنستان بنا دیا ہے حضور ذرا بالاخانہ پر چل کر سیر فرمائیں، ابو اسحٰق نے بالاخانہ پر چڑھ کر دیکھا تو چاروں طرف فوجیں پھیلی ہوئی ہیں، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ شاہ مظفر کا لشکر ہے، مسکرا کر کہا عجب احمق ہے اس بہار میں یوں اوقات خراب کرتا ہے، یہ شعر پڑھ کر نیچے اتر آیا۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم ۔۔۔ چو فردا شود فکر فردا کنیم

(غرض مظفر نے شیراز فتح کر لیا، اور شاہ ابو اسحٰق قتل کر دیا گیا، خواجہ صاحب کو سخت رنج ہوا، چنانچہ ایک قطعہ لکھا جس میں اس عہد کے تمام ارباب کمال کا تذکرہ کیا)

بہ عہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحٰق ۔۔۔ بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد
نخست بادشہے ہمچو او ولایت بخش ۔۔۔ کہ گوئی فضل ربود او بہ عدل و بخشش داد
دوم بقیہ ابدال شیخ امین الدین ۔۔۔ کہ بود داخل اقطاب و مجمع اوتاد
سوم چو قاضی عادل اصیل ملت و دین ۔۔۔ کہ قاضی بہ از و آسمان ندارد یاد
دگر چو قاضی فاضل عضد کہ در تصنیف ۔۔۔ بنای شرح مواقف بنام شاہ نہاد
دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل ۔۔۔ کہ او بہ جود چو حاتم، ہمی صلا در داد
نظیر خویش بہ گذاشتند و بگذشتند ۔۔۔ خدای عز و جل جملہ را بیامرزاد

شاہ ابو اسحٰق کے مرنے کا صدمہ خواجہ صاحب کو مدت تک رہا، غزلوں میں بھی بے اختیار ابو اسحٰق کا نام زبان پر آجاتا ہے۔

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی ۔۔۔ خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

(ابو اسحاق کے بعد محمد بن مظفر مبارزالدین شیراز و فارس کا حکمران ہوا) وہ اصل میں خراسان کا باشندہ تھا، جس زمانہ میں سلطان ابوسعید نے وفات پائی اور طوائف الملوکی شروع ہوئی تو اس نے سنہ ۷۴۱ھ میں فوجیں فراہم کر کے آس پاس کے مواضع پر حملہ شروع کیا، سب سے پہلے یزد پر قبضہ کیا، رفتہ رفتہ اس کے حدود حکومت نہایت وسیع ہوگئے۔

(محمد بن مظفر نہایت متقشف تھا، تخت نشین ہونے کے ساتھ ہر جگہ محتسب مقرر کئے اور تمام میخانے بند کرا دیے) تذکرۂ تقی الدین حسینی میں لکھا ہے کہ خواجہ حافظ نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی ہے،

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است ۔۔۔ بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن ۔۔۔ کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است
ز رنگ بادہ بشوئید خرقہا از اشک ۔۔۔ کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

خواجہ صاحب کے دیوان میں ایک غزل ہے جو شراب خانوں کے بند ہونے کا نہایت پراثر مرثیہ ہے۔

بود آیا کہ درمیکدہ ہا بکشایند؟ ۔۔۔ گرہ از کار فروبستہ ما بکشایند
گیسو چنگ ببرید بمرگ مئے ناب ۔۔۔ تا ہمہ مغبچہ ہا زلف دوتا بکشایند
نامۂ تعزیت دختر رز بنویسید ۔۔۔ تا حریفاں ہمہ خون از مژہ ہا بکشایند
درِ میخانہ ببستند خدایا مپسند ۔۔۔ کہ درِ خانۂ تزویر و ریا بکشایند
اگر از بہر دلِ زاہد خود بیں بستند ۔۔۔ دل قوی دار کہ از بہرِ خدا بکشایند

یہ غزل اسی زمانہ کی ہے،

امیر مبارزالدین کا بیٹا شاہ شجاع جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس نے بھی اس موقع

پر ایک رباعی لکھی اور خوب لکھی،

در مجلس دہر ساز مستی پست است ، نہ چنگ نہ قانون و نہ دف بر دست است
رندان ہمہ ترکِ مے پرستی کردند ، جز محتسب شہر کہ بے مے مست است

(امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شجاع فرماں روا ہوا) وہ اس سلسلہ کا سرتاج اور علم و فن کا پشت و پناہ تھا، وہ علم و فن کی گود میں پلا تھا، سات برس کے سن میں تعلیم شروع کی، نو برس میں قرآن مجید حفظ کیا، قاضی عضد سے شرح مفصل وغیرہ پڑھی۔

حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کے سننے میں عربی کے چھ سات شعر یاد ہو جاتے تھے، عربی و فارسی میں اس کے مکاتبات اہل ادب میں مقبول عام ہیں، علم و فضل کی قدر دانی کی وجہ سے اس کا دربار علماء و فضلاء کا قبلۂ حاجات تھا، شعر بھی کہتا تھا، تقی الدین حسینی نے اپنے تذکرہ میں بہت سے اشعار لکھے ہیں، ایک رباعی یہ ہے۔

احوالِ بدم ز خلق پنہان مے کن ، و احوالِ جہان بر دلم آسان می کن
امروز خوشم بدار و فردا با من ، آنچہ از کرم تو می سزد آن می کن

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع سے پہلے میخانوں کی جو روک ٹوک تھی شاہ شجاع نے آزادیِ تجارت کے لحاظ سے اٹھا دی، خواجہ صاحب کے دیوان میں ایک غزل ہے وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

غزل یہ ہے،

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش ، کہ دورِ شاہ شجاع است می دلیر بنوش
شد آں، کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند ، ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگِ چنگ بگوئیم آں حکایتہا ، کہ از شنیدنِ آں دیگ سینہ میزد جوش

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند — گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کی آزاد پسندی نے میخواروں کو بہت آزاد کر دیا تھا، اس بناء پر خواجہ صاحب اس کے بہت ممنون ہیں، اور جو غزلیں شاہ شجاع کی مدح میں لکھی ہیں، سب میں اس کا بڑے جوش سے تذکرہ کیا ہے ؎

قسم بہ حشمت و جاہ و جلال شاہ شجاع — کہ نیست باکسم از بہر مال و جاہ نزاع
بہ بیں کہ رقص کناں می رود بہ نالۂ چنگ — کسے کہ اذن نمی داد استماع سماع

ایک اور غزل میں کہتے ہیں،

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر — جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع
عمر خسرو طلب ار نفعِ جہاں می طلبی — کہ وجودیست عطا بخش و کریمِ نفاع
مظہرِ لطفِ ازل روشنی چشم امل — جامع علم و عمل جانِ جہاں شاہ شجاع

(خواجہ صاحب نے اگرچہ جا بجا اپنے اشعار میں شاہ شجاع کا نام مداحانہ انداز سے لیا ہے چنانچہ ایک غزل میں فرماتے ہیں)

خیال آب خضر بست و جام کیخسرو — بہ جرعہ نوشے سلطان ابوالفوارس شد
(شاہ شجاع کی کنیت)

لیکن شاہ شجاع خواجہ صاحب سے صاف نہ تھا، شجاع کے عہد میں خواجہ عماد فقیہ مشہور عالم تھے، شجاع ان کا نہایت معتقد تھا،

خواجہ عماد کی ایک بلی تھی جس کو انھوں نے اس طرح تعلیم دی تھی کہ جب وہ نماز پڑھتے تو بلی بھی نماز پڑھنے کے انداز سے جھکتی اور سر اٹھاتی، خواجہ حافظ نے اسی زمانہ میں ایک غزل لکھی،

صوفی بہ جلوہ آمد و آغاز ناز کرد — بنیاد مکر با فلکِ حقہ باز کرد

اس بلی پر ظرافت سے یا خواجہ عماد کو ریاکار سمجھ کر خواجہ حافظ نے یہ شعر لکھا

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز   غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

غالباً شجاع کی ناراضی کی ابتدا اسی شعر سے ہوئی، رفتہ رفتہ کشیدگی زیادہ بڑھتی گئی، ایک دن شجاع نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ کی کوئی غزل یکساں اور ہموار نہیں ہوتی، ایک شعر میں تصوف، دوسرے میں می پرستی، تیسرے میں شاہد بازی، اس طرح ہر شعر میں رنگ بدلتا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا ہاں، لیکن ان سب برائیوں کے ساتھ بھی میری غزلیں میری زبان سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل جاتی ہیں، بخلاف اوروں کے کہ ان کا قدم شہر کے دروازے سے بھی باہر نہیں نکلتا، شجاع کو اس گستاخانہ اور آزادانہ جواب پر اور زیادہ ملال ہوا،

اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں خواجہ صاحب نے ایک غزل لکھی جس کا مقطع تھا،

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد   وای گر در پس امروز بود فردائے

شجاع نے یہ غزل سنی تو اس بہانہ سے کہ اس سے قیامت کا انکار یا کم از کم شبہہ پایا جاتا ہے خواجہ صاحب کو ستانا چاہا، خواجہ صاحب بہت پریشان ہوئے، حسن اتفاق یہ کہ مولانا زین الدین ابوبکر تائبادی حج کو جاتے ہوئے شیراز سے گذرے، خواجہ صاحب نے ان سے یہ ماجرا بیان کیا، انھوں نے صلاح دی کہ مقطع کے اوپر ایک شعر لکھ دو جس سے مقطع دوسرے کا مقولہ بن جائے، خواجہ صاحب نے اسی وقت کہا،

دلم دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحر گہ می گفت

بادف و بربط و نے منبچہ ترسائے

(شاہ شجاع نے سنہ ۷۸۶ھ میں انتقال کیا، اس کے بعد شاہ منصور بن محمد مظفر بادشاہ ہوا، وہ بھی بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا، خواجہ صاحب نے اس کی مبارکباد میں غزل لکھی،

بیا کہ رایت منصور پادشاہ رسید　　نوید فتح و ظفر تا بہ مہر و ماہ رسید
(منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کیا۔)

منصور اگرچہ نہایت دلیر اور صاحب عزم تھا، لیکن تیمور کی سطوت و عظمت کا غلغلہ تمام عالم میں پڑ چکا تھا، اس لئے چاہا کہ شیراز سے نکل جائے شہر پناہ کے دروازہ پر پہنچا تو ایک بڑھیا نے کہا کہ ایک مدت تک بادشاہی کر کے رعایا کو مصیبت میں چھوڑ کر کہاں بھاگے جاتے ہو؟ منصور وہیں سے پلٹا اور صرف دو ہزار فوج سے تیمور پر حملہ آور ہوا اور پے درپے تیمور کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا قلب فوج تک پہنچ گیا، تیمور پر تلوار کا وار کیا، غفاری اینات نام ایک افسر نے بڑھکر تلوار کو سپر پر روکا، چار دفعہ پے درپے تلوار ماری لیکن ہر دفعہ غفاری اینات سپر ہو جاتا تھا اور تیمور کو بچا لیتا تھا، بالآخر فوجوں نے چاروں طرف سے ہجوم کر کے منصور کو قتل کر دیا، جس کا خود تیمور کو افسوس رہا، وہ کہا کرتا تھا کہ آج تک معرکوں میں کسی کو منصور کا ہمسر نہیں دیکھا،

تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا کہ میں نے تمام عالم کو اس لیے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو میرا وطن ہے آباد کروں، تم ان کو ایک تل کے عوض میں دیئے ڈالتے ہو،

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے کہا انہیں فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی ہے،

خواجہ صاحب کی غزلیں اب چار دانگ عالم میں پھیل گئیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

بہ شعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

(اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں، چنانچہ عراق، عرب، ہندوستان، ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے، بغداد کا فرمان روا سلطان احمد بن اویس تھا جو تمام کمالات کا مجموعہ تھا) مصوری، زر نگاری، کمان سازی، خاتم بندی وغیرہ ان تمام فنون میں بڑے بڑے صناع اس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے، موسیقی میں یہ کمال تھا کہ خواجہ عبدالقادر نے اس کی شاگردی اختیار کی، اس فن میں اس کی متعدد تصنیفات ہیں، جو مدت تک گویوں کا دستور العمل رہیں، ان باتوں کیساتھ سخن سنج اور شاعر تھا،[1] (خواجہ صاحب کو اس نے بار بار بلایا) خواجہ صاحب بھی للچائے (چنانچہ بعض غزلوں میں اس کے اشارے بھی ہیں، لیکن پھر بھی رکنا باد کی خاک دامن نہیں چھوڑتی تھی چنانچہ خود فرماتے ہیں،)

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر نسیم بادِ مصلیٰ و آبِ رکنا باد

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر سلطان احمد کو بھیجی[2]

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان احمد شیخ اویس حسن ایلخانی
خان بن خان شہنشاہ شہنشاہ نژاد آں کہ می زیبد اگر جان جہانش خوانی
از گل فارسیم غنچۂ عیشے نشگفت حبذا دجلۂ بغداد و مے ریحانی
بر شکن کاکل ترکانہ کہ در طالع تست دولت خسروی و منصب چنگیزخانی

اگرچہ خواجہ صاحب بغداد جا نہ سکے، لیکن شوق کا کانٹا ہمیشہ دل میں

۱؎ دولت شاہ ۲؎ ایضاً

کھٹکتا رہا، چنانچہ جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

رہ زبریم بہ مقصود خود اندر شیراز خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند

(دکن میں سلاطین بہمنیہ کا دور تھا، اور سلطان شاہ محمود بہمنی مسند آرا تھا وہ نہایت قابل اور اد صاحب کمال تھا، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا، عام حکم تھا کہ عرب و عجم سے جو شاعر آئے اس کو پہلے قصیدہ پر ایک ہزار ٹنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے، انعام میں دیے جائیں۔

(اس کی قدر دانیوں کا شہرہ سن کر خواجہ صاحب کو دکن کے سفر کا خیال ہوا، لیکن خیال ہی خیال تھا، یہ خبر میر فضل اللہ کو پہنچی جو محمود کے دربار میں صدارت کے منصب پر ممتاز تھے، انھوں نے زادراہ بھیجکر طلبی کا خط لکھا) خواجہ صاحب نے اس روپے میں سے کچھ بھانجوں کی ضروریات میں صرف کئے، کچھ ادائے قرض میں صرف ہوا، جو باقی رہ گیا اس سے زادراہ سفر کا سامان کرکے شیراز سے روانہ ہوئے مقام لار میں پہنچے تو وہاں ایک دوست سے ملاقات ہوئی، جن کا مال و اسباب چالان ہی میں لٹ گیا تھا، خواجہ صاحب نے جو کچھ پاس تھا ان کے حوالہ کر دیا، اور آپ خالی ہاتھ رہ گئے، اتفاق یہ ہے کہ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی جو مشہور تاجر تھے، ہندوستان آرہے تھے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو خواجہ صاحب کے مصارف کے کفیل ہوئے، لیکن سوداگروں سے ایک نازک مزاج شاعر کی ناز برداریاں کہاں انجام پا سکتی ہیں، خواجہ صاحب کو رنج ہوا تاہم صبر کیا، اور محمود شاہی جہاز پر جو دکن سے ہرمز کے بندرگاہ میں آیا تھا، اور ہندوستان کو واپس جارہا تھا، سوار ہوئے،

سو اتفاق یہ کہ جہاز نے لنگر بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ہوا کا طوفان اٹھا، خواجہ صاحب فوراً جہاز سے اتر آئے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کو بھیجی ؎

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بہ می بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہ تاجِ سلطانی کہ بیم جان درو درج است — کلاہ دلکش است اما بہ دردسر نمی ارزد
بہ کوے میفروشانش بہ جامے در نمی گیرند — زہی سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوے دُر — غلط کردم کہ یک موجش بہ صد من زر نمی ارزد

(فضل اللہ نے غزل سلطان محمود بہمنی کی خدمت میں پیش کی اور تمام ماجرا بیان کیا، سلطان نے ملا محمد قاسم مشہدی کو جو دربار کے فضلا میں سے تھے، ایک ہزار تنکہ طلا دیا کہ ہندوستان کے عمدہ مصنوعات خرید کرکے لیجائیں اور خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کریں[۱])

(سلطان غیاث الدین بن سلطان سکندر فرمانروائے بنگالہ نے بھی جو ۸۶۸ھ میں تخت نشین ہوا تھا، خواجہ صاحب کے کلام سے مستفید ہونا چاہا، چنانچہ طرح کا یہ مصرع بھیجا، ع

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر بھیجی،

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود — ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاث دیں — غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود)

خواجہ صاحب نے ۷۹۳ھ میں وفات پائی "خاک مصلّیٰ" تاریخ ہے جس میں

---

[۱] یہ پورا قصہ تاریخ فرشتہ میں ہے۔

ایک عدد کی کمی ہے،

مصلّٰی ان کا محبوب مقام تھا، اس لئے دفن بھی یہیں ہوئے سلطان بابر بہادر کے زمانہ میں محمد معمائی نے جو صدارت کی خدمت پر ممتاز تھا، خواجہ صاحب کا مقبرہ بصرف کثیر تیار کرایا جو اب تک قائم ہے، ان کے نام کی مناسبت سے اس جگہ کا نام حافظیہ ہو گیا ہے، ہفتہ میں ایک خاص دن مقرر ہے، لوگ زیارت کو وہاں جاتے ہیں، وہیں دن بسر کرتے ہیں، کھاتے پکاتے ہیں، چاء پیتے ہیں، کہیں کہیں شراب کا دور بھی چلتا ہے، کوئی رنگین مزاج خواجہ صاحب کے نام کا حصہ خاک پر گرا دیتا ہے، خواجہ صاحب نے پانسو برس پہلے کہہ دیا تھا،

بر سر تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ ۔۔۔ کہ زیارت گہ رندانِ جہاں خواہد بود

آل و اولاد خواجہ صاحب کی آزادہ مزاجی اور رندی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہوں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی، صاحبزادہ کا نام **شاہ نعمان** تھا، وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں بہ مقام برہان پور وفات ہوئی، ان کی قبر قلعہ اسیر کے متصل ہے[۱]،

دیوان میں ایک قطعہ ہے۔

صباح جمعہ بُد سادس ربیع اول ۔۔۔ کہ گشت فرقت آں مہ بکشیتم حاصل

بسال ہفتصد و شصت و چہار از ہجرت ۔۔۔ چو آب حل بشدم ایں دقیقۂ مشکل

غالباً یہ قطعہ بیوی کی وفات میں لکھا ہے، ایک اور قطعہ ہے،

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند ۔۔۔ چہ دید اندر خم ایں طاقِ رنگیں

---

[۱] خزانۂ عامرہ بحوالہ مرأۃ الصفا،

بجائے لوحِ سیمیں در کنارش فلک بر سر نہادہ لوحِ سنگیں

اگرچہ ممکن ہے کہ یہ قطعہ کسی اور جوانا مرگ کی شان میں ہو، لیکن زیادہ قیاس یہی ہے کہ خود انہی کا کوئی فرزند تھا جو آغاز عمر میں گذر گیا تھا،

خواجہ صاحب کی تحصیل علم اور ان کے مبلغ کا حال تذکرہ نویسوں نے مطلق نہیں لکھا، میخانہ سے جس کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے، صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ محلہ میں جو مکتب تھا، اس میں تعلیم پائی تھی، لیکن کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے علوم درسیہ کی تحصیل مستعدانہ کی تھی، اکثر غزلوں میں عربی کے مصرعے جس برجستگی سے لاتے ہیں، اس سے ان کی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بعض غزلوں میں متعدد شعر، خالص عربی میں ہیں اور سلاست و فصاحت میں جواب نہیں رکھتے،

الا اے ساربانِ محملِ دوست الی رکبانکم طال اشتیاقی
درونم خون شد از نادیدنِ یار الا تعساً لایام الفراق
بیا ساقی بدہ رطلِ گرانم سقاک اللہ من کاس دهاق
نهانی الشیب عن وصل العذاری سوی تقبیل خد واعتناق

سلام اللہ من کرّ اللیالی علی ملک المکارم والمعالی
فحبک راحتی فی کل حین وذکرک مونسی فی کلّ حال
سبت سلمی بصدغیها فوادی وروحی کل یوم لی تنادی

گر تیغ بارد در کوئے آں ماہ گردن نہادیم الحکم للہ
الصبر مر والعمر فان یا لیت شعری حتام القاہ

جا بجا عربی کے جملے اس خوبصورتی سے پیوند کرتے ہیں کہ گویا انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے،

چو ہست آب حیات بدست تشنہ ممیر ❊ فلا تمت و من الماء کل شیء حی

بخیل بوئے خدا نشنود، بیا حافظ ❊ پیالہ گیر و سخن ورز و الفهمان علی

قرآن مجید اور تفسیر کے ساتھ اُن کو خاص لگاؤ تھا، دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ تفسیر کشاف پر حاشیہ بھی لکھا ہے، خود فرماتے ہیں۔

ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد ❊ لطائف حکما با کتاب قرآنی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کی تفسیر میں معقول کو منقول سے تطبیق دیتے تھے، فن قرآت میں کمال تھا، اس کے ساتھ خوش آواز تھے،[1] معمول تھا کہ ہمیشہ جمعہ کی رات کو مسجد کے مقصورہ میں تمام رات خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتے،

قرآن مجید حفظ یاد تھا، اور اسی مناسبت سے حافظ تخلص رکھا تھا، قرآن دانی پر ان کو ناز تھا، چنانچہ اشعار میں جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ ❊ بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ ❊ آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

تجرد اور آزادی عام تذکروں کا بیان ہے کہ خواجہ صاحب دنیاوی تعلقات سے آزاد تھے اور سلاطین و امراء سے بے نیاز رہتے تھے، لیکن خود ان کے کلام سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، ان کے زمانہ میں شیراز کے جو جو فرماں روا گذرے، سب کی مدح میں ان کے قصائد موجود ہیں، اور اسی شان کے ہیں جو عام مدح گویوں کا انداز ہے، شاہ شجاع کی مدح میں ایک قصیدہ ہے، جس میں لکھتے ہیں

---

[1] ہفت اقلیم امین رازی

دارای دہر شاہ شجاع، آفتابِ ملک　　خاقانِ کامگار و شہنشاہِ نوجواں
حکمش رواں چو باد باطرافِ بحر و بر　　مہرش رواں چو روح در اعضای انس و جاں
بی طلعتِ تو جاں نگراید نہ کالبد　　بی نعمتِ تو مغز نبندد در استخواں

سلطان ابو اسحٰق کی مدح میں بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

سپیدہ دم کہ صبا بوی بوستاں گیرد　　چمن ز لطفِ ہوا نکتہ بر جناں گیرد

مدح میں لکھتے ہیں،

جمالِ چہرۂ اسلام شیخ بو اسحاق　　کہ ملک در قدمش زیبِ بوستاں گیرد

سلطان محمود کی مدح مثنوی میں لکھی ہے جس کا ذکر آگے آئیگا، منصور کے وزراء میں سے ایک بدہمت نے رائے دی تھی کہ علماء و فضلاء کے وظیفے جن کی تعداد ، توان تھی بند کر دیے جائیں، منصور نے نہ مانا، اس پر خواجہ صاحب نے قصیدہ لکھا[۱]

چوں ز آسمان نہاد حمائل برابرم　　یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم
منصور بن محمد غازی است حرزِ من　　واز این خجستہ نام بر اعدا مظفرم
ای شاہِ شیر گیر چہ گردد، اگر شود　　در سایۂ تو ملکِ فراغت میسرم

جا بجا خود ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین اور امراء کے نام مدحیں لکھ کر بھیجیں کہ صلہ ہاتھ آئے، چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

شاہ ہرمزم ندیدہ بے سخن صد لطف کرد　　شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نہ داد
کار شاہاں ایں چنیں باشد تو ای حافظ مرنج　　داور روزی رساں توفیق و نصرت شاں دہاد

ایک اور قطعہ میں لکھتے ہیں،

---

[۱] حبیب السیر،

خسروا! دادگرا! شیر دلا! بحر کفا   اے کمال تو بہ انواع ہنر ارزانی

در دو سال آنچہ بہ بیند وختم از شاہ وزیر   ہمہ بربود بہ یک دم فلک چوگانی

غرض یہ بالکل غلط ہے کہ خواجہ صاحب ہات پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے، اور کسب معاش کی کچھ فکر نہ کرتے تھے، البتہ فرق یہ ہے کہ اُن کے تمام معاصرین بلکہ پیشتر و نہایت ذلیل اور کمینہ طریقوں سے کام لیتے تھے، انوری، ظہیر فاریابی، سلمان ساوجی کس پایہ کے لوگ تھے، لیکن سب کا یہ چال تھا کہ کسی کی مدح لکھی اور اس نے صلہ کم دیا یا دیر لگائی تو ہجو شروع کر دیتے تھے، اور یہاں تک نوبت پہنچاتے تھے کہ تہذیب شائستگی آنکھیں بند کر لیتی تھی، ظہیر وغیرہ کے کلام میں سیکڑوں قطعے اور قصائد ہیں جن میں اس درجہ کا گدایانہ ابرام ہے کہ ان کو دیکھکر شرم آتی ہے، خواجہ صاحب اس سفلہ پن سے بری ہیں، وہ مدح لکھتے ہیں، صلہ ملا تو بہتر اور نہ یہ کہہ کے چپ ہو جاتے ہیں کہ تقدیر میں نہ تھا، کبھی کبھی ہلکا سا تقاضا بھی کرتے ہیں، لیکن پیرایہ نہایت لطیف ہوتا ہے، ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

بہ مجمع خواجہ رساں ای رفیق وقت شناس   بہ خلوتے کہ دراں اجنبی صبا باشد

لطیفہ بہ میاں آر و خوش بخندانش   بہ نکتہ کہ دلش را دراں رضا باشد

پس آنگہے ز کرم ایں قدر بپرس بہ لطف   کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

ایک اور قطعہ میں کس لطف سے کنایہ کیا ہے۔

دوش در خواب چناں دید خیالم کہ سحر   گذر افتاد بر اصطبل شہم پنہانی

بستہ بر آخور (اصطبل) او استر (خچر) من جو می خورد   توبرہ افشاند و بمن گفت مرا میدانی

ہیچ تعبیر ہمی دانمش ایں خواب کہ چیست   تو بفرمائے کہ در فہم نداری ثانی

یعنی میں نے کل خواب دیکھا کہ میرا گذر شاہی اصطبل خانے کی طرف ہوا، وہاں میرا خچر

کھا رہا تھا، مجھ کو دیکھ کر اس نے تو بڑہ کا رخ میری طرف کر کے جھاڑا، اور کہا کہ کیوں مجھ کو پہچانتے ہو؟ اس خواب کی مجھ کو تعبیر نہیں معلوم ہوتی، آپ بڑے نکتہ فہم ہیں، آپ ہی بتایئں کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ مطلب یہ کہ گھوڑے کے دانے چارے کا سامان کر دیجیے۔"

معاشرت | ان کے اشعار و جستہ جستہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سادگی اور آزادی سے بسر کرتے تھے، حافظ قرآن تھے، قرآن مجید کے نکات اور حقائق پر درس دیتے تھے، لیکن باایں ہمہ اظہار تقدس سے نہایت نفرت رکھتے تھے، صاف دل اور بے تکلف تھے، جو دل میں تھا، وہی زبان پر تھا، کوئی برائی کرتے تو ریاکاری کے پردے میں چھپا کر نہ کرتے، رکنا باد جو ایک چشمہ ہے شیراز کی مشہور سیرگاہ ہے، اب تو محض ذرا سی نہر رہ گئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اس کے کنارے بیٹھ کر عالم آب کا لطف اٹھاتے تھے، دوست احباب جمع ہوتے، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے لے کر اس کا ذکر کرتے ہیں۔

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا را

رکنا باد کے منبع کا نام اللہ اکبر ہے، اس کا بھی ذکر جا بجا کرتے ہیں،

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جای اوست　　تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

جو ارباب کرم ان سے اچھا سلوک کرتے تھے، اکثر غزلوں میں ان کا ذکر احسان مندی کے ساتھ کرتے ہیں، یہ طریقہ ان کا خاص انداز ہے،

بخواہ جام صبوحی بہ یاد آصف عہد　　وزیر ملک سلیماں عماد دین محمود

ع　　چہ غم دارم چو در عالم قوام الدین حسن دارم

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال　　ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

مطرب بہ پردہ سازی، شاید اگر بخواند　　از طرز شعر حافظ در بزم شاہزادہ

تو بایں نازکی و سرکشی اے شمع چگل　　لائق بزمگہ خواجہ جلال الدینے

باتو گر زیں پس فلک خواری کند　　بازگو در حضرت دارائے رتے

خسرو آفاق بخشش کز عطا　　نامۂ حاتم ز نامش گشت طے

از برائے صید دل در گردنم زنجیر زلف　　چوں کمند خسرو مالک رقاب انداختی

نصرت الدین شاہ یحییٰ آنکہ تاج آفتاب　　از سر تعظیم و قدرت در تراب انداختی

اے در رخ تو پیدا انوار پادشاہی　　در فکرت تو پنہاں صد حکمت الٰہی

عمریست پادشاہا کز مے تہی است جامم　　اینک ز بندہ دعویٰ، وز محتسب گواہی

انصاف پسندی | خواجہ صاحب اگرچہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ ان کے تمام ہمعصر شعرائے غزل گوئی میں ان کے سامنے ہیچ تھے، تاہم وہ سب نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں، بلکہ اپنے آپ کو ان کا پیرو کہتے ہیں، خواجو کرمانی کی نسبت کہتے ہیں۔

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما　　دارد غزل حافظ طرز و روش خواجو

فخر کے جوش میں آکر کہتے ہیں،

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمان است　　کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

لیکن انصاف سے دیکھو تو یہ ان کے لیے ننگ ہے، ظہیر کو غزل میں ان سے کیا نسبت؟

اس زمانہ میں کمال خجندی مشہور شاعر اور صاحب کمال تھے، خواجہ صاحب سے ان سے بہت راہ و رسم تھی، وہ خواجہ صاحب کی غزلیں منگوایا کرتے اور اپنا کلام ان کو بھیجتے۔

ایک دفعہ اپنی یہ غزل بھیجی،

گفت یار از غیر پوشاں نظر گفتم بچشم　　وانگہے دزدیدہ در ما می نگر گفتم بچشم

غزل میں یہ شعر بھی تھا،

گفت اگر سر در بیابانِ غم خواہی نہاد تشنگان را مژدۂ از ما ببر گفتم بچشم

خواجہ صاحب اس شعر پر پہنچے تو ان پر حالت طاری ہوئی، افاقہ کے بعد کہا کہ واقعی اس شخص کا پایہ بہت بلند ہے[1]

کلام | تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کا دیوان صرف ۲۰ برس میں تیار ہوا، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، خلاف قیاس ہونے کے علاوہ غزلوں میں جا بجا جن لوگوں کے نام آتے ہیں ان کے زمانوں میں برسوں کا آگا پیچھا ہے،

(خواجہ صاحب کی شہرت اگرچہ صرف غزل میں ہے لیکن انھوں نے قصائد اور مثنویاں بھی لکھی ہیں، اور گو وہ تعداد میں کم ہیں لیکن ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے تمام اصناف پر اُن کی قدرت حاصل تھی) عام خیال ہے کہ جو لوگ غزل اچھی لکھتے ہیں، قصیدہ اور مثنوی اچھی نہیں لکھتے لیکن خواجہ صاحب کے قصیدے بھی کچھ کم نہیں اور مثنوی میں تو وہ صفائی لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہے

سرِ فتنہ دارد دگر روزگار من و مستی و فتنۂ چشمِ یار
فریبِ جہاں قصۂ روشن است بہ بیں تا چہ زاید شب آبستن است
ہماں مرحلہ است ایں بیابان دور کہ گم شد درو لشکر سلم و تور
ہماں منزل است ایں جہانِ خراب کہ دیدہ است ایوانِ افراسیاب
چہ خوش گفتہ جمشید با تاج و گنج کہ یک جو نیرزد سرائے سپنج
مغنی کجائی بہ گلبانگِ رود بہ یاد آور آں خسروانی سرود

[1] دولت شاہ تذکرۂ کمال خجندی،

مغنی بزن چنگ برار غنون	براز دلم فکر دنیائے دون
چناں برکش آہنگ این داورے	کہ ناہید چنگی برقص آورے
مغنی دف و چنگ را ساز دہ	بہ یاران خوش نغمہ آواز دہ
مغنی کجائی نوائے بزن	بہ یکتائی او دوتائے بزن
بیا ساقی این نکتہ بشنو زنے	کہ یک جرعہ مے بہ زدیہیم کے
بیا ساقی آب اندیشہ سوز	کہ گر شیر نوشد شود بیشہ سوز
بیا ساقی آں آتش تابناک	کہ در دشت می جویدش زیر خاک
بدہ تا بگویم بآواز نے	کہ جمشید کے بود و کاؤس کے
مے دہ کہ بدنام خواہم شدن	خراب مے و جام خواہم شدن
بیا ساقیا مے کہ تا دم زنیم	قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
سبک باش در طل گرانم بدہ	دگر فاش نتواں نہانم بدہ
کہ این چرخ و ایں انجم آبنوس	لبے یاد دارد ز بہرام و طوس
بدہ ساقی آں آب افسردہ را	بیا زندہ ساز این دل مردہ را
کہ ہر پارہ خشتے کہ بر منظری است	سر کیقبادی و اسکندری است
ہر آن گل کہ در گلستانی بود	مہ عارض دلستانی بود
ہر آں شاخ سروے کہ در گلشنے است	قد دلبر و زلف سیمیں تنے است

خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی اساتذہ سے پیچھے نہیں لیکن ان کا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے یہ عموماً مسلّم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہ ہو سکا، متوسطین اور متاخرین غزل کے بزم آرا ہیں، لیکن ان کو تسلیم ہے کہ خواجہ صا

کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا،

صائب — ردا ست صائب اگر نیست از راہ دعوی — تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی است

صائب چہ تواں کرد بتکلیف عزیزاں — ورنہ طرز خواجہ شدن بے بصری بود

ع چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد،

سلیم — سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ باش — کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی

عرفی نے کبھی غزل میں کسی استاد کا نام نہیں لیا تاہم کہتا ہے۔

برآں تتبع حافظ ار دراست چوں عرفی — کہ ژاژ بکار درود ورد سخنوری داند

غزل گوئی — خواجہ صاحب کی غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اس کو ترقی دی، ساتویں صدی کا چمن انہی بلبلوں کے زمزموں سے گونج رہا تھا کہ سلمان ساوجی اور خواجو کرمانی نے نغمہ سنجی شروع کی، سعدی اور خسرو کے آگے اگرچہ ان کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا لیکن یہ دونوں اور اصناف سخن یعنی قصیدہ گوئی اور مثنوی میں اس قدر ممتاز اور نام آور تھے کہ اس اثر نے غزل میں بھی کام دیا، اس کے ساتھ ان لوگوں نے غزل میں کچھ جدتیں بھی پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق کے موافق تھیں، اسلئے اور کبھی بڑھی اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت نے بھی ساتھ دیا، سلمان بغداد کے ملک الشعراء اور خواجو ابو اسحق فرمانروائے شیراز کے دربار میں سب سے ممتاز تھے،

اساتذہ کا تتبع — غرض خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا، خواجہ صاحب نے دونوں کا زمانہ پایا تھا، اور اتفاق یہ کہ خواجو نے جب ۷۵۳ھ میں شیراز میں وفات پائی تو وفن اسی مقام یعنی اللہ اکبر میں ہوئے جو حافظ کی خاص سیر گاہ تھی اور جس کی شان میں فرماتے ہیں،

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جای اوست ۔۔۔ تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

خواجہ صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا، چنانچہ خود فرماتے ہیں، ع

دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو

جو غزلیں ہم طرح ہیں، ان میں جابجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں، سلمان کی غزلوں پر بھی اکثر غزلیں ہیں اور ان سے بھی اس قدر جابجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوان میں موجود ہیں، اور ایک نقطہ کا فرق نہیں، اسی بنا پر بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کاتبوں نے حافظ، خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہایت خلط ملط کر دیا ہے،

خواجہ صاحب کے کلام کا خواجو وغیرہ سے موازنہ کرنا اگرچہ اس لحاظ سے غیر ضروری ہے کہ آج کسی کو حافظ کی ترجیح میں کلام نہیں بلکہ خواجہ صاحب کی غزلوں کے مقابلہ میں خواجو اور سلمان کی غزلوں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، لیکن شاعری کی تاریخ کا ایک ضروری باب ہے کہ شاعری کی ترقی کے تدریجی مدارج دکھائے جائیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ سعدی، خواجو اور سلمان ہی کے خاکے ہیں، جن پر حافظ نے نقش آرائیاں کی ہیں، اس لئے ان کے باہمی امتیاز اور تدریجی ترقی کا دکھانا شعر العجم کا ضروری فرض ہے،

سعدی اور خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے، خواجو نے دنیا کی بے ثباتی، وسعت مشرب، اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا، اکثر غزلیں پوری کی پوری صرف دنیا کی بے ثباتی پر ہیں مثلاً یہ غزل۔

ہیچ صاحب نظران ملک سلیمان باد است ۔۔۔ بلکہ آن است سلیمان کہ ز ملک آزاد است

این کہ گویند کہ برآب نہادہ ست جہاں — مشنوای خواجہ اگر چوں درنگری برباد ست

یا مثلاً یہ غزل

مشو بہ ملک سلیمان و مال قاروں شاد — کہ مال و ملک بود در رہ حقیقت باد

خواجہ صاحب نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے، سلمان کا خاص مذاق، مضمون آفرینی، جدت تشبیہ اور صنائع لفظی ہے، خواجہ حافظ بھی ان چیزوں کو لیتے ہیں لیکن یہ ان کا خاص انداز نہیں، سعدی، خسرو اور حسن کا کلام ہمہ تن عشق، سوز و گداز، بیان شوق، ناامیدی اور حسرت ہے، خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں، چنانچہ اکثر غزلیں ان کی غزلوں پر لکھی ہیں لیکن وہ فطرۃً شگفتہ مزاج اور ولولہ خیز طبیعت رکھتے تھے، اس لئے درد و غم کے نغمے ان سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے،

خواجہ صاحب نے سعدی، خواجو، سلمان کے جواب میں جو غزلیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کے فرق مراتب کا اندازہ ہو سکے،

حافظ	خواجو
دوش از مسجد سوے میخانہ آمد پیر ما	خرقہ، رہن خانہ خمار دارد پیر ما
چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما	اے ہمہ رنداں مرید پیر ساغر گیر ما

خواجہ صاحب کا مطلع ہر پہلو سے خواجو کے مطلع سے بڑھا ہوا ہے اور یہ محتاج اظہار نہیں،

حافظ	خواجو
در خرابات مغاں ما نیز ہمدستاں شدیم	گرشدیم از بادہ بدنام جہاں تدبیر چیست

کایں چنیں رفت ست از روز ازل تقدیر ما | ہمچنیں رفت است از روز ازل تقدیر ما

خواجہ صاحب نے خواجو ہی کے مضمون اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر دیا ہے، اور افسوس ہے کہ کچھ بھی ترقی نہیں کی، دوسرا مصرع تو حرف حرف خواجو ہی کا مصرع ہے، پہلا مصرع خواجو کا زیادہ برجستہ اور صاف ہے، اس کے ساتھ تدبیر اور تقدیر کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے آیا ہے، خواجہ صاحب نے یہ حسن بھی کھو دیا، خواجو کے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ شراب نے اگر ہم کو رسوا کر دیا تو علاج کیا؟ تقدیر یوں ہی تھی، خواجہ صاحب کہتے ہیں ہم کو بھی مغوں کا ساتھ دینا پڑا، تقدیر میں یہی لکھا تھا، خواجہ صاحب کو مضمون کے لحاظ سے بھی کچھ ترجیح نہیں

خواجو
ما دلِ دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم
اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما

حافظ
عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است
عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے یہ بات اضافہ کی کہ عاقلوں کے دیوانۂ زنجیر ہونے کی وجہ ظاہر کر دی یعنی یہ کہ زلف کی قید کس قدر پر لطف ہے، اس کے علاوہ خواجہ صاحب کا پہلا مصرع زیادہ صاف اور ڈھلا ہوا ہے لیکن خواجو کے مصرع میں ایک خاص نکتہ ہے جو خواجہ صاحب کے ہاں نہیں، خواجو کہتا ہے کہ میرا دیوانہ دل زنجیر زلف میں پھنس گیا، یہ وہ زنجیر ہے کہ عاقل بھی اس کے دیوانے بن گئے، جس سے اس بات کی معذرت نکلتی ہے کہ جب عقلا اس زنجیر میں پھنستے ہیں تو دیوانہ کا پھنسنا کیا تعجب ہے؟ اس کے علاوہ دیوانوں کو عموماً زنجیر میں باندھتے ہیں، اس لئے دل کا زلف میں گرفتار ہونا قدرتی بات تھی، خواجہ صاحب نے دل کی دیوانگی کا کچھ ذکر نہیں کیا اس لئے گرفتاری کی کوئی معقول وجہ نہیں، خواجو کے ہاں عاقل و دیوانہ کے لفظی تقابل نے جو لطف پیدا کیا ہے خواجہ صاحب کے ہاں وہ بھی نہیں۔

خواجو

از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو
کز کمانِ بزم زخمش سخت باشد تیر ما

حافظ

تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش
رحم کن بر جانِ خود پرہیز کن از تیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے کوئی ترقی نہیں دی، بلکہ اس کے لطف کو کم کر دیا، خواجو نے معشوق سے صرف اس قدر کہا تھا کہ "غافل مشو" خواجہ صاحبؒ خاموش اور رحم کن بر جانِ خود" سے معشوق کو خطاب کرتے ہیں، جو آدابِ عشق کے بالکل خلاف ہے۔

خواجو

آیا صبا خبرے کن مرا ازاں کہ تو دانی
بداں زمیں گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی
چو مرغ در طیران آئی و چوں بہ اوج رسی
نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی
چناں مرو کہ غبارے بہ در رسد گذارت
بداں طرف چو رسیدی چناں بیاں کہ تو دانی

حافظ

نسیم صبح سعادت [illegible] نشاں کہ تو دانی
گذر بکوی فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی
تو پیک حضرت شاہی مرا [illegible] دیدہ بر راہست
بہ مردمی نہ بفرمان بسیر ہر آں کہ تو دانی
بگو کہ جانِ ضعیفم ز دست رفت خدا را
ز لعل روح فزا [illegible] ببخش ازاں کہ تو دانی
من ایں دو حرف نوشتم چناں کہ غیر ندانست
تو ہم ز روی کرامت بخواں چناں کہ تو دانی

دونوں نے صبا کو قاصد بنایا ہے اور اس کو ہدایتیں کی ہیں، خواجو نے صبا کو مرغ سے اور معشوق کے گھر کو آشیانہ سے تشبیہ دیکر بدمزگی پیدا کردی، لیکن اخیر کا شعر نہایت لطیف ہے یعنی اے صبا اس طرح آہستہ اور مودب جانا کہ گرد تک اٹھنے پائے، اور بتانے کی

کیا حاجت ہے، تو خود آداب داں ہے جیسا مناسب سمجھنا کرنا،

خواجہ صاحب کا مطلع نہایت برجستہ ہے، صبا کے بجائے نسیم اور اس پر صبحِ سعادت کی قید نے لطف پیدا کر دیا ہے، خواجو کے مصرع میں زمین و زماں کا جو لفظی تناسب تھا، تکلف سے خالی نہ تھا، اس لئے خواجہ صاحب نے اس کو اڑا دیا، "بداں زمین" کے بجائے "بہ کوی فلاں" کا کہنا بہ زیادہ لطیف ہے .... دوسرا شعر بھی نہایت لطیف ہے، کہتے ہیں کہ تو شاہی قاصد ہے میں تجکو حکم نہیں دے سکتا، البتہ مروت اور انسانیت کے اقتضا سے توقع رکھتا ہوں، اخیر شعر اور زیادہ پر مزہ ہے معشوق سے کہتے ہیں کہ میں نے یہ سطریں اس طرح چھپا کر لکھی ہیں کہ غیروں کو خبر نہیں ہونے پائی تم بھی اسی طرح پڑھنا جیسا کہ مناسب ہو، یعنی کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حافظ	خواجو
مجو درستی عہد از جہانِ بے بنیاد	دل درین پیرزنِ عشوہ گر دہر مبند
کایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است	کیں عروسے است کہ در عقد بسے داماد است

مضمون وہی ہے لیکن خواجہ صاحب کی بندش میں زور حسن ہے، پہلے مصرع میں صرف اس قدر کہنا چاہیے کہ دنیا میں دل نہ لگاؤ، پھر اس کی وجہ بتانی چاہیے کہ یہ ایک ایسی عجوزہ ہے جو ہزاروں کے نکاح میں ہے، خواجو نے پہلے ہی کہہ دیا کہ عجوزہ دہر سے دل نہ لگاؤ، حالانکہ جب پہلے ہی عجوزہ کہہ دیا تو اس دلیل کی ضرورت نہیں رہی کہ وہ کثیر الازدواج ہے کیونکہ بڑھیا سے یوں بھی انسان کو محبت نہیں ہوتی، خواجہ صاحب نے پہلے دنیا کی برائی کو مطلق حیثیت سے بیان کیا، پھر ایک ساتھ نفرت کی دو وجہیں بتائیں یعنی یہ بڑھی ہے اور کثیر الازدواج بھی ہے۔

حافظ	خواجو
ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار چہ مست	منزل اریار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت

سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت　　ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو کے شعر کو خواجہ صاحب کے شعر پر ترجیح ہے، اول تو خواجو نے مطلع میں جس میں قافیہ کی پابندی ہو جاتی ہے، ایسے وسیع مضمون کو ادا کیا ہے، اس کے ساتھ دونوں عالم کی دونوں چیزیں لے لیں، یعنی دوزخ اور بہشت، مسجد اور کنشت، ان سب کے علاوہ مسجد کی تنکیر اور تعمیم اور نیاز کی قید نے جو لطف پیدا کیا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں مطلق نہیں، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ مسجد اور گرجا دونوں عشق کے گھر ہیں، اور ایک ہی چیز ہیں، خواجو دونوں کو مخالف تسلیم کر کے کہتا ہے کہ سجدۂ نیاز وہ چیز ہے کہ موافق و مخالف ہر جگہ ادا کیا جا سکتا ہے اس میں یہ بھی اتنا ہے کہ سجدۂ نیاز گر میں بھی ادا کیا جائے تو مسجد بن جاتا ہے۔

خواجو　　حافظ

کے برکنم دل از رخ جاناں کہ مہر او　　عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم
با شیر در دل آمد و با جان بدر شود　　با شیر در بدن شد و با جاں بدر شود

خواجہ صاحب نے جس طرح اس مضمون کو ترقی دی ہے محتاج اظہار نہیں۔

خواجو اور خواجہ صاحب کی غزلیں اکثر ہم طرح ہیں، اختصار کے لحاظ سے ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے سلمان کی اکثر غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں جن میں کہیں سلمان کی تقلید کی ہے کہیں سلمان کی مضمون کو لیکر زیادہ دلکش پیرایہ میں ادا کیا ہے، کہیں سلمان کے آئینہ کو زیادہ جلا دیدی ہے۔

سلمان　　حافظ

آوازۂ جمالت نادر جہاں فتادہ　　عید است و موسم گل ساقی بیار بادہ

حافظ	سلمان
ہنگام گل کہ دیدہ است بے می قدح نہادہ	خلقے بجستجویت سر در جہاں نہادہ

دونوں مطلعے بالکل الگ الگ ہیں، ان میں کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا۔

حافظ	سلمان
گل رفت اے حریفاں غافل چرا نشینید	سودای زہد خشکم برباد دادہ حاصل
بے بانگ رود و چنگے بے یار و جام و بادہ	مطرب بزن ترانہ، ساقی بیار بادہ

سلمان کا دوسرا مصرع نہایت برجستہ اور مستانہ ہے۔

حافظ	سلمان
زیں زہد پارسائی بگرفت خاطر من	ایم بستہ دل را در لعل دلکشایت
ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ	آں لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ

صنعت اضداد کا دونوں نے لحاظ رکھا ہے، لیکن سلمان کے الفاظ زیادہ صاف ہیں، یعنی بستن و کشادن، گرفتن اور کشادن میں بھی گو یہی صنعت ہے لیکن گرفتن کے اصلی معنی یہ نہیں ہیں بلکہ محاورہ نے یہ معنی پیدا کئے ہیں، اس کے علاوہ دل کے کھلنے کی توجیہہ سلمان کے ہاں لفظاً اور معنیً دونوں لحاظ سے زیادہ روشن ہے، یعنی تو لب کھول تو ہمارا دل بھی کھلے، کیونکہ ہمارا دل تیرے لبوں میں بندھا ہوا ہے، پیالہ سے دل کھلنے میں یہ بات نہیں،

حافظ	سلمان
در مجلس صبوحی دانی چہ خوش نماید	سودائیان زلفت گردد حلقہ بستہ
عکس عذار ساقی بر جام می فتادہ	شوریدگان مویت در یکدگر فتادہ

مضمون کے لحاظ سے دونوں شعر الگ الگ ہیں، البتہ قافیہ مشترک ہے، اور سلمان کے ہاں اچھا بندھا ہے، یوں بھی سلمان کا شعر اچھا ہے۔

شیخ سعدی کے جواب دینے کی گو اکثر غزلیں ہیں، لیکن درحقیقت دونوں کے راستے

الگ الگ ہیں اسلئے ان میں موازنہ نہیں ہوسکتا، تاہم متعدد مضامین خواجہ صاحب نے شیخ سعدی سے لئے ہیں، لیکن ان کے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی انہی قطروں کے بنے ہیں، مثالیں جدتِ اسلوب کے عنوان میں آئیں گی۔

خواجہ صاحب کی خصوصیات تم نے دیکھا! خواجہ صاحب اپنے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں، ان کی شاعری کے مہاتِ مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ خیام کے ابرِ قلم کے رشحات ہیں، بایں ہمہ ان کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا، اس کے آگے سعدی، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہو گئیں؟ اس کا کچھ سبب ہوگا اور وہی خواجہ صاحب کی خصوصیاتِ شاعری ہیں یہ خصوصیات اگرچہ درحقیقت ذوقی اور وجدانی ہیں جو صرف مذاقِ سلیم سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم جس قدر ضبطِ تحریر میں آسکتا ہے وہ حسبِ ذیل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوراوروں کے ہاں نکل آئے، لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع ـــــ

ـــــ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے۔

ان میں بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جو اوروں کے کلام میں اس درجہ تک نہیں پائے جاتے ہیں مثلاً روانی، برجستگی اور صفائی، یہ وصف سعدی اور خسرو کا بھی مابہ الامتیاز ہے، لیکن یہ ایسی چیز ہے جس کے مدارج کی حد نہیں، ممکن ہے کہ ایک شعر خود نہایت رواں اور صاف و شستہ ہو، لیکن ایک اور شعر اس سے بھی بڑھ کر

ہو، اور اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور شعر ہو، جس طرح نغمہ اور حسن کہ ان کے مدارج ترقی کی کوئی حد نہیں،

ایک اور چیز جو خواجہ صاحب کی شاعری کا نہایت نمایاں وصف ہے جوش بیان ہے اسی طرح تنوع مضامین بھی، ان سے پہلے اس قدر نہ تھا چنانچہ ہم ان کے کلام کے تمام اوصاف کو الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

جوش بیان | فارسی شاعری، باوجود ہزاروں گوناگوں اوصاف اور خیالات کے جوش بیان سے خالی ہے، فردوسی اور نظامی کے ہاں خاص خاص موقعوں پر جوش بیان کا پورا زور ہے لیکن وہ اوروں کے خیالات اور واردات ہیں، خود شاعر کے حالات اور جذبات نہیں، بخلاف اس کے خواجہ حافظ کے کلام میں جو جذبات ہیں وہ خود ان کے واردات اور حالات ہیں اس لئے اگر وہ اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے، جوش بیان کے لئے کسی مضمون یا کسی خیال کی خصوصیت نہیں، ہر مضمون اور ہر خیال جوش کے ساتھ ظاہر کیا جا سکتا ہے، البتہ اختلاف نوعیت کی وجہ سے صورتیں بدل جاتی ہیں مثلاً شاعر جوش مسرت کا بیان کرتا ہے تو اس انداز سے کرتا ہے کہ گویا آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، قہر اور غضب کا بیان ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا مرقع الٹ دے گا، دنیا کی بے ثباتی کا مذکور ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالم ہیچ ہے، غصہ اور غضب کا مضمون ہے تو نظر آتا ہے کہ منہ سے انگارے برس رہے ہیں۔

خواجہ صاحب نے سیکڑوں گوناگوں خیالات ادا کئے ہیں اور جس خیال کو ادا کیا ہے اس جوش کے ساتھ کیا ہے کہ سننے والے پر وہی اثر طاری ہو جاتا ہے جو خود

خواجہ صاحب کے دل میں ہوتا ہے ،) ✓

اعتمادے نیست بر دور جہاں	بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم	زمانہ کی بے اعتباری
سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود	کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند	استقلال و ثبات قدمی
حلقۂ پیر مغاں از ازل در گوش ماست	ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود	وجد و ذوق
در نمازم خم ابروے تو در یاد آمد	حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد	افسانۂ عشق کی دل آویزی
از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر	یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند	واعظوں کے وعظ و پند کی تحقیر
بادہ خور غم مخور و پند مقلد مشنو	اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن	معشوق کی دلفریبی
می ترسم از خرابیِ ایماں کہ می برد	محراب ابروے تو حضور نماز من	مستی کی تمنا
زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب	ما را ز جام بادۂ گلگوں خراب کن	کمال کسی پر محدود نہیں
فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید	دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد	ہمہ تن وفا و محبت ہونا
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم	از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس	اعلان راز
داستان در پردہ می گویم ولے	گفتہ خواہد شد بدستان نیز ہم	
محتسب داند کہ حافظ می خورد	آصف ملک سلیماں نیز ہم	
رنگ تزویر پیش ما نبود	شیر سرخیم و افعی سیہیم	ظاہر و باطن یکساں ہونا
گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر	تا سحرگہ ز کنار تو جواں برخیزم	معشوق کی روح افزائی
اے نور چشم من سخنے ہست گوش کن	تا ساغرت پر است بنوشان و نوش کن	جود و کرم کی ترغیب
بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات	با دردکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد	غریبوں کے ستانے کا انجام
سوز آہ سینۂ سوزان من	سوخت ایں افسردگانِ خام را	سوز دل کا اثر

(روش بیان کا اصلی موقع وہاں آتا ہے جہاں کسی خاص جذبہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے مثلاً

رنج و غم، فخر و ناز، غیظ و غضب، عشق و محبت۔

خواجہ صاحب پر رندی اور سرمستی کا جذبہ غالب تھا، ان کے تمام کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس کے اندازہ کرنے کے لیے پہلے ایک رند سرمست کی حالت کا تصور باندھو کہ جب مستی کے جوش و خروش میں ہوتا ہے، تو اس کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں، وہ مزے میں آکر پکارتا ہے کہ مجھ کو نام و ننگ کی کچھ پروا نہیں، ساقی پیالہ پر پیالہ دیئے جا، اور کسی سے نہ ڈر، زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں، مطرب سے کہدو یہ ترانہ گائے کہ تمام دنیا پر میری حکومت ہے، کل خاک میں جانا ہی ہے آج کیوں نہ عالم میں غلغلہ ڈال دوں، تم مجھے حقیر سمجھتے ہو، شراب خانہ میں آؤ تو تم کو نظر آئے کہ میری کیا شان ہے؟ میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جمشید کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا، میں شراب آج سے نہیں پیتا، مدت سے آسمان اس غلغلہ سے گونج رہا ہے، صوفی اور واعظ رازدانی کی شیخیاں بگھارتے ہیں، حالانکہ جو کہتے ہیں مجھی سے سن لیا تھا، یہ عالم لطف اٹھانے کے لیے کافی نہیں، آؤ آسمان کی چھت توڑ کر ایک نیا عالم بنائیں، خواجہ صاحب ان خیالات کو اسی جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس طرح ایک سرمست کے دل میں آتے ہیں۔

(ابھی یہ بحث چھوڑ دو کہ خواجہ صاحب کی شراب، معرفت کی شراب ہے یا انگور کی مستی دونوں میں ہے اور یہاں صرف مستی سے غرض ہے۔)

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم	فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
آؤ پھول برسائیں اور شراب پیالہ میں ڈالیں	آسمان کی چھت توڑ ڈالیں اور نئی بنا ڈالیں
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد	من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

اگر غم عاشقوں کے مقابلہ کے لئے فوج تیار کرے، تو ہم اور ساقی دونوں ایکا کرکے اس کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دیں۔

چو در دست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش   کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

رند مزے میں آکر جب گاتا ہے تو دونوں طرف ہاتھ جھٹکتا ہے، پاؤں زمین پر دے مارتا ہے، سر کو داہنے بائیں جھٹکے دیتا ہے، یہ شعر بجنسہ اس حالت کی تصویر ہے۔

ساقی بہ نور بادہ برافروز جام ما   مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم   اے بیخبر ز لذت شرب مدام ما

ساقیا برخیز و دردہ جام را   خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں   ما نمی خواہیم ننگ و نام را

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود   سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود
حلقہ پیر مغانم ز ازل در گوش است   ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود
بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ   کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است   حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

حاصل کارگہ کون و مکاں اینہمہ نیست[1]   بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں اینہمہ نیست

ساقی بیار بادہ و با مدعی بگو   انکار ما مکن کہ چنیں جام جم نداشت
خوش وقت رند مست کہ دنیا و آخرت   از دست داد و ہیچ غم بیش و کم نداشت

ما مے بہ بانگ چنگ نہ امروز می خوریم   بس دور شد کہ گنبد چرخ ایں صدا شنید
سر خدا کہ عارف و سالک بکس نگفت   در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
ساقی بیا کہ عشق ندا می کند بلند   کاں کس کہ گفت قصہ ما ہم ز ما شنید

---

[1] یعنی کچھ ایسی کائنات نہیں

من ترکِ عشق بازی و ساغر نمی کنم صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم
من رند و عاشق و آنگاہ توبہ استغفر اللہ استغفر اللہ
ما زہد و تقوی کمتر شناسیم یا جام بادہ یا قصہ کوتاہ

شرابِ عیش نہاں چیست کارِ بے بنیاد زدیم بر صفِ رندان و ہرچہ بادا باد

سخن درست بگویم نمی توانم دید کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم
گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم
نہ قاضیم نہ مدرس نہ مفتیم نہ فقیہم مرا چہ کار کہ منعِ شراب خوارہ کنم

با منِ خاک نشیں خیز و سوئے میکدہ آے تا بہ بینی کہ دراں حلقہ چہ صاحب جاہم

اے خوشا حالتِ آں مست کہ در پائے حریف سر و دستار نہ داند کہ کدام اندازد

خوش تر از فکرِ می و جام چہ خواہد بودن چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن
پیرِ میخانہ چہ خوش گفت معمای دوش از خطِ جام کہ فرجام چہ خواہد بودن
بادہ خور غم مخور و پندِ مقلد مشنو اعتبارِ سخنِ عام چہ خواہد بودن

غمِ دنیای دنی چند خوری بادہ بخور حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد

ساقی بیا کہ شد قدحِ لالہ پُر ز مے طامات تا بچند و خرافات تا بکے

شیخم بہ طنز گفت حرام است می مخور گفتم برو کہ گوش بہر خر نمی کنم

کہ برد بہ نزدِ شاہاں ز منِ گدا پیامے کہ بکوی می فروشاں دو ہزار جم بجامے

صبح است ژالہ می چکد از ابرِ بہمنی برگِ صبوح ساز و بدہ جامِ یک منی
ساقی بہ ہوش باش کہ غم در کمینِ ماست مطرب نگاہ دار ہمیں رہ کہ میزنی
بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نشود ز زہدِ ہمچو توئی یا ز رندیِ چو منی

ما مرد زہد و توبہ و طامات نیستیم — با ما بجام بادۂ صافی خطاب کن

زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب — ما را بجام بادۂ گلگوں خراب کن

یہ مضامین کہ دنیا چار دن کی چاندنی ہے، اس کے لئے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پڑنے سے کیا حاصل، کھاؤ پیو، لطف اٹھاؤ اور دنیا سے گذر جاؤ، سو سو طرح بندھ چکے ہیں، اور خیام کی تمام شاعری کی یہی کائنات ہے، لیکن خواجہ صاحب کے یہاں جو جوشِ بیان پایا جاتا ہے فارسی شاعری اس سے خالی ہے۔

شراب تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش — کہ تا یکدم بیاسایم ز دنیا و ز شر و شورش

کمند صید بہرامی بیفگن جام مے بردار — کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام است نے گورش

گور خر

می دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے — فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

من ایں مقام بدنیا و آخرت ندہم — اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے

دنیا کی شان و شوکت، جاہ و جلال، دھوم دھام ان کو للچانا چاہتے ہیں لیکن ان کے دل سے یہ صدا آتی ہے کہ "تا کے؟ یہ نیرنگیاں کب تک؟ اس جھوٹے طلسم کے لئے زندگی کو کیوں آلودہ کیا جائے"،

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدست روزگار — چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

حاصل کارگہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست — بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست

بیفشاں جرعۂ بر خاک و حال اہل شوکت پرس — کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

گرہ بباد مزن گرچہ بر مراد وزد — کہ ایں سخن بمثل باد با سلیماں گفت

یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اس قدر چھا گیا تھا کہ بوریائے فقر ان کو مسند جمشید نظر آتا تھا، وہ

خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اٹھائیں، وہ مناظر قدرت سے، بہار سے، آب رواں سے، سبزہ و مرغزار سے لطف اٹھاتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے، اس بنا پر وہ تمام دنیا کو خوش عیشی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، یونان میں اپیکیورس کی بھی یہی تعلیم تھی، لیکن وہ فلسفی تھا، اسلئے جو کچھ کہنا تھا، فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا، خواجہ صاحب شاعر تھے اور فطری شاعر تھے اس لئے انھوں نے خوش عیشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان تک جوش مسرت سے لبریز نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا اصلی کمال ہے،

عیدست ساقیا قدحے پر شراب کن / دور فلک درنگ ندارد شتاب کن
بنوش بادہ کہ ایام غم نخواہد ماند / چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند
دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد / بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است / کلاہ دلکش است اما بدرد سر نمی ارزد
غم دنیائے دنی چند خوری بادہ بخور / حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد
خوشتر از فکر می و جام چہ خواہد بودن / چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

بہار سے لطف اٹھاتے ہیں،

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد / عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد
ارغواں جام عقیقی بہ سمن خواہد داد / چشم نرگس بہ شقائق نگراں خواہد شد
مطربا مجلس انس است غزلخوان و سرود / چند گوئی کہ چنیں است و چناں خواہد شد
بلبل ز شاخ سرو بہ گلبانگ پہلوی / می خواند دوش درس مقامات معنوی
مرغان باغ قافیہ سنجند و بذلہ گوی / تا خواجہ می خورد بہ غزلہائے پہلوی

درویشم و گدا و برابر نمی کنم　　پشمین کلاہ خویش بہ صد تاج خسروی

خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن　　کیں عیش نیست درخور اورنگ خسروی

آخرالامر گل کوزہ گراں خواہی شد　　حالیا فکر سبو کن کہ پر از بادہ کنی

ای کہ در کوی خرابات مقامی داری　　جم وقت خودی ار دست بہ جامی داری

ای کہ با زلف و رخ یار گذاری شب و روز　　فرصتت باد کہ خوش عیش دوامی داری

می خواہ و گل افشاں کن از دہر چہ می جوئی　　ایں گفت سحر گہ گل بلبل تو چہ می گوئی

مسند بہ گلستاں بر شاہد و ساقی را　　لب گیری و رخ بوسی می نوشی و گل بوئی

خواجہ صاحب کے اس خاص کمال (جوش بیان) کا اندازہ اس وقت اچھی طرح ہو سکتا ہے جب انہی مضامین کے متعلق اور اساتذہ کے کلام کا موازنہ کیا جائے، نمونہ کے لئے ہم صرف چند شعروں پر اکتفا کرتے ہیں۔

سلمان	حافظ
رندی و عاشقی و قلاشی ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست	عاشق و رند و نظربازم و میگویم فاش تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام
درون صافی ز اہل صلاح و زہد مجوی کہ ایں نشانۂ رنداں درد آشام است	راز درون پردہ ز رنداں مست پرس کیں حال نیست صوفی عالی مقام را
مکن ملامت رنداں دگر بہ بدنامی کہ ہر چہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است	گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را
غرض از کعبہ و بتخانہ توئی سلماں را چکنم خانہ بہ خانہ خدا باید رفت	جلوہ بر من مفروش ای ملک الحاج کہ تو خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم

من ازاں روز کہ در بند توام آزادم | پادشاہم چو بدست تو اسیر افتادم
ای گنج نوشدارو و برخستگان نظر کن[1] | مرہم بدست و مارا مجروح می گذاری
شادم می گویم واز گفتۂ خود دلشادم | بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم
یا رب این بادکہ تو اں گفت کہ آں نوش لبا | کشت مارا و دم عیسیٰ مریم با دست

بدیع الاسلوبی یعنی جدت وخوبی ادا | اکثر مضامین ایسے ہیں جو مدتوں سے بندھتے آتے تھے یا بندھے نہ تھے، لیکن بجائے خود معمولی مضمون تھے، جن میں کوئی دلفریبی نہ تھی، خواجہ صاحب کے حسن اسلوب اور جدت ادا نے اس کو نہایت دل آویز اور لطیف کر دیا، مثلاً معشوق کی آنکھ کو سب مخمور سرشار اور مست کہتے آئے ہیں، خواجہ صاحب اسی بات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

ہر کس کہ بدید چشم او گفت　　کو محتسبے کہ مست گیرد

یعنی جس نے اس کی آنکھ دیکھی بول اٹھا کہ کہیں محتسب تو نہیں کہ مست کو گرفتار کرے،
معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا معمولی بات ہے، خواجہ صاحب اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ میزد　　صبا حکایت زلف تو درمیاں انداخت

یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے کہ تصویر کھینچ دی ہے، بنفشہ گویا ایک حسین اور جمیلہ ہے اس کی زلفیں نہایت خوبصورت اور گھونگھر والی ہیں، وہ بڑے ناز و انداز سے بیٹھی ہوئی چوٹی میں گرہیں لگا رہی ہے، اتنے میں کہیں سے صبا آنکلی، اس نے معشوق کی زلفوں کا ذکر چھیڑ دیا، بنفشہ عین غرور اور ناز کی حالت میں شرما کر رہ گئی۔
جدت میں جدت یہ ہے کہ نتیجہ یعنی بنفشہ کا شرمندہ ہو جانا بیان نہیں کیا کہ اس کے اظہار کی

---

[1] یہ شعر سعدی کا ہے،

ضرورت نہیں،

زاہد کی نسبت یہ خیال ظاہر کرنا مقصود تھا کہ گو وہ شراب وغیرہ استعمال نہیں کرتا تاہم چونکہ اس کی فتوحات اور نذور، ریا اور زور کے ذریعہ سے ہاتھ آتی ہیں اس لئے وہ بھی حرام سے کم نہیں، اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

ترسم کہ صرفہ نبرد روز بازخواست نانِ حلالِ شیخ ز آب (شراب) حرام ما

یعنی مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن شیخ کی حلال روٹی، میرے آب حرام (شراب) سے بازی نہ لے جا سکے، جدت اسلوب کے ساتھ ہر لفظ ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے، ترسم سے دکھانا ہے کہ میں اس بات کو بطور شماتت کے نہیں کہتا، بلکہ ہمدردی کے لحاظ سے مجھ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو، قیامت کو بازخواست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ کھوٹے کھرے کے پرکھنے کا دن ہے، نان حلال، اور آب حرام کے مقابلہ نے علاوہ صنعت اضداد (تضاد) کے جو نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے، اصل مضمون کو نہایت بلیغ کر دیا ہے، یعنی زاہد کی روٹی باوجود حلال ہونے کے میرے آب حرام سے بازی نہ لیجائے تو زاہد کے لئے کس قدر افسوس کا سبب ہوگا،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوی داد کہ می حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

اسی طرز ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو، اول تو اس امر کا اعتراف کہ شراب گو حرام سہی لیکن مالِ وقف سے بہرحال اچھی ہے، خود فقیہ کی زبان سے کرایا ہے، اس کے ساتھ مست کی قید لگا دی ہے، جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہ بھی بات کا اظہار یوں کاہے کو کرتا، مست تھا، اس لئے پس و پیش کا خیال نہ آیا اور جو دل میں تھا، زبان سے کہہ گیا۔

زاہد خدا کا تصور جو دلوں میں قائم کراتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ مجسّم قہر و غضب ہے، ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتا رہتا ہے، اور نہایت بے رحمانہ سزائیں دیتا ہے، لیکن اہل نظر کے نزدیک خدا سرتاپا لطف اور رحم ہے، اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

پیر دردی کش ما اگرچہ ندارد زر و زور
خوش عطا بخش و خطا پوش خدائے دارد

"خدائے" کی تنکیر نے کیا لطف پیدا کیا ہے، گویا ایسا خدا بہت غیر معروف ہے، زاہد وغیرہ سے اس سے مطلق شناسائی نہیں،

✓ یہ مضمون کہ میں نے معشوق کا انتخاب ایسی دیدہ وری سے کیا کہ ہر شخص نے اس کی داد دی، اس کو یوں ادا کرتے ہیں۔

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے بصر نہ کرد

یعنی جس نے تیرا چہرہ دیکھا، میری آنکھیں چوم لیں کہ کیا عمدہ انتخاب ہے، میری آنکھ نے جو کام کیا دیکھ بھال کے کیا۔

شاہد بازی کی نسبت یہ عذر خواہی کہ اور لوگ بھی تو کرتے ہیں، عام مضمون ہے، سعدی فرماتے ہیں،

گر کند میل بہ خوبان دل من خردہ مگیر
کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اسی مضمون کو خواجہ صاحب جدید اور لطیف اسلوب سے ادا کرتے ہیں۔

من ارچہ عاشقم و رند و مست و نامہ سیاہ
ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند

شعر کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ میں اگرچہ گنہگار اور نالائق ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ شہر میں اور لوگ پاکیزہ خیال ہیں جن کی برکت سے میری شامت اعمال کا اثر اوروں پر نہ پڑے گا، لیکن حقیقت میں یہ اوروں پر در پردہ چوٹ ہے، سعدی نے کھلے لفظوں

میں کہہ بیا، خواجہ صاحب کنایۃً ادا کرتے ہیں،

خدا کے عفو کے بھروسہ پر شراب پینے کی جرأت اس پیرایہ میں دلاتے ہیں،

بیار بادہ بخور زاں کہ پیر میکدہ دوش بہ بے حدیث غفور و رحیم و رحمٰن گفت

اس موقع پر خدا کے متعدد نام جن سے رحم اور مغفرت کا اظہار ہوتا ہے، لانا کس قدر بلاغت ہے،

دنیا کی بے ثباتی کو اس انداز میں ادا کرتے ہیں،

سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا کچھ اعتبار نہیں، اسلیے یہ چند روزہ زندگی عیش و عشرت میں گذار دو، کل خدا جانے کیا ہوگا، اس مضمون کے لیے کس قدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہے، عیش اور کامیابی میں جمشید سب سے نامور ہے، تاہم خود اس کی مجلس میں یہ راگ گایا جاتا تھا، اس سے بڑھکر دنیا کی بے ثباتی کا کیا ثبوت ہوگا، جمشید کا نام اس بے تکلفی سے لینا کہ القاب و خطاب ایک طرف، پورا نام بھی نہیں، اس مضمون کو نہایت با اثر کر دیتا ہے،

شرم از آں چشم سیہ بادش و مژگان دراز ہر کہ دل بردن او دید و در انکار من است

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ جو شخص میرے اوپر اعتراض کرتا ہے اگر معشوق کو دیکھ لیتا تو اعتراض سے باز آتا، اس کو یوں ادا کیا ہے کہ جو شخص میری دل باختگی پر اعتراض کرتا ہے، اس کو معشوق کی آنکھ اور مژگان سے شرم نہیں آتی، یعنی مجھ پر اعتراض گویا آنکھوں کی دلربائی سے انکار کرنا ہے،

یارب بکہ تواں گفت ایں نکتہ کہ در عالم رخسارہ بکس ننمود آں شاہد ہر جائی

اس مضمون کو کہ شاہد مطلق "خدا" کا جلوہ اگرچہ ایک ایک ذرہ میں چمکتا ہے، لیکن اس کی

حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، کس بدیع اسلوب سے ادا کیا ہے یعنی کس قدر تعجب ہے کہ ہرجائی بھی ہے اور آج تک کسی نے اس کو دیکھا بھی نہیں، قاآنی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

اے کہ در ہیچ جا نہ وری حبا   بوالعجب ماندہ ام کہ ہرجائی

لیکن خواجہ صاحب کی طرزِ ادا میں لطافت کے علاوہ اسلوب بھی زیادہ معنی خیز ہے،

بدیع الاسلوبی کے اچھی طرح سے سمجھ میں آنے کے لئے ہم چند مثالیں لکھتے ہیں، جن سے ظاہر ہوگا کہ ایک مضمون جو کسی اور استاد نے باندھا تھا، خواجہ صاحب نے خوبیِ ادا سے اس کو کس قدر بلند رتبہ کر دیا ہے۔

سعدی	حافظ
گرچہ امیر و ما فقیریم دل داریِ دوستاں ثواب است	در راہِ عشق، فرقِ غنی و فقیر نیست ای بادشاہِ حسن سخن با گدا بگو
ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم تو عشقِ گلے داری من عشقِ گل اندامی	بنال بلبل اگر با منت سر یاری است کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

شیخ صاحب کہتے ہیں کہ "بلبل اگر تو رونے پر آمادہ ہو تو میں بھی تیرا ساتھ دینے کو موجود ہوں، مجھ کو تجھ سے ہمدردی کی یہ وجہ ہے کہ تو گل پہ عاشق ہے اور میرا معشوق بھی گل اندام ہے، غرض شیخ نے ہمدردی کی وجہ معشوق کا ایک گونہ اشتراک قرار دیا ہے لیکن یہ پہلو نزاکت اور غیرت سے ذرا ہٹا ہوا ہے، اس لئے خواجہ صاحب ہمدردی کی وجہ صرف عشق کی شرکت قرار دیتے ہیں، معشوق کے اشتراک سے کوئی تعلق نہیں، اس کے ساتھ خود بلبل کے پیرو نہیں بنتے، بلکہ بلبل کو اپنا پیرو بناتے ہیں، "و" کے لفظ پر جو زور دیا ہے اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ عشق کے صحیح دعویدار صرف وہی ہو سکتے ہیں، عاشق اور بلبل، ان باتوں کے ساتھ زار و زاری کے اجتماع اور مطلع ہونے نے شعر کو نہایت بلند پایہ کر دیا ہے،

سعدی	حافظ
ای گنج نوشدارو بر خستگان نظر کن	چہ عذر از بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب
مرہم بدست و ما را مجروح می گذاری	بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد

خواجہ صاحب نے شیخ کے مضمون کا پیرایہ کس قدر لطیف کر دیا ہے۔

سلمان	حافظ
رندی و عاشقی و قلاشی	عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش
ایچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست	تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام

چستی بندش اور جوشِ بیان کے علاوہ سلمان صرف یہ کہتے ہیں کہ مجھ میں یہ سب باتیں ضرور ہیں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان باتوں پر ان کو فخر ہے یا ندامت، خواجہ صاحب صرف ان اوصاف کے پائے جانے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کو باعثِ ناز قرار دیتے ہیں، ع

تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام

سلمان	حافظ
مکن ملامت رنداں دگر بہ بد نامی	گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
کہ ہر چہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است	ما نمی خواہیم ننگ و نام را

سلمان کہتے ہیں کہ ہم کو ملامت نہ کرو جس چیز کو تم ننگ سمجھتے ہو وہی ہمارے نزدیک ناموری کی بات ہے، اس مضمون میں یہ نقص ہے کہ اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کو نام کی خواہش ہے، اگرچہ وہ نام اوروں کے نزدیک ننگ ہے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم کو نام و ننگ سے

مے سے غرض ہی نہیں اور رندی کی یہی شان ہے،

حافظ	سلمان
شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد	شاہد آن نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل
بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد	شاہد آن ست کہ این دارد و آنے دارد
	دیدہ ام طلعتِ زیبا کش کہ آنے دارد
	این ہمہ شیفتہ از پے آں می گردم

اصل مضمون یہ تھا کہ معشوق میں صرف تناسبِ اعضاء کا نام نہیں بلکہ اصلی چیز ناز و انداز ہے، سلمان نے اس مضمون کو جس طرح ادا کیا، اس میں ایک لفظی خوبی یعنی این و آن کا مقابلہ شامل کر دیا، جس سے اصل مضمون کا زور گھٹ گیا، اس لئے خواجہ صاحب نے اصل مضمون کو صنعت لفظی سے بالکل الگ کر کے بیان کیا، لیکن این و آں کا لطف بھی ہاتھ سے دینے کے قابل نہ تھا، اس لئے دوسرے موقع پر اس کو زیادہ نمایاں پیرایہ میں ادا کیا،

این کہ می گویند آں بہتر از حسن　　　یار ما این دارد و آں نیز ہم

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہیں، ہمکو صرف نمونہ دکھانا مقصود تھا،

ان جزئی اسالیب سے قطع نظر کر کے کلی اسالیب پر نظر ڈالو، خواجہ صاحب نے جن مضامین کو زیادہ تر باندھا ہے، وہ شراب کی تعریف، رندی و مستی کی ترغیب، دنیا کی بے ثباتی، واعظوں اور زاہدوں کی پردہ دری ہے، ان میں سے ہر مضمون کے ادا کرنے کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے، اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انہی مضامین پر اور اساتذہ کے سیکڑوں ہزاروں اشعار موجود ہیں، لیکن عام محفلوں میں خواجہ صاحب ہی کے ترانے زبانوں پر ہیں۔

<u>واردات عشق</u> | خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے، اور ہر نوع کو اعلیٰ رتبہ پر

پہنچایا ہے، لیکن ان کی اصلی شاعری عشق و عاشقی اور رندی و سرمستی ہے) رندانہ مضامین وہ حسب آزادی، رنگینی اور جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اس کی تفصیل جوش بیان کے عنوان میں گذر چکی (عشقیہ مضامین سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے، لیکن یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے (جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ آئے ہیں) کہ خواجہ صاحب کے عشقیہ جذبات غم اور درد سے کم تعلق رکھتے ہیں، وہ فطرتاً شگفتہ مزاج اور رنگین طبع تھے، اس لیے عشق و عاشقی سے اُن کو وہیں تک تعلق ہے جہاں تک لطف طبع اور شگفتگی خاطر کے کام آئے وہ ناامیدی، حسرت، یاس وغیرہ پر کچھ لکھتے ہیں تو محض تقلید ہوتی ہے) وہ غمگین منہ بنانا بھی چاہتے ہیں تو چہرہ سے شگفتگی نہیں جاتی، اس بنا پر وہ شوق، ناز و نیاز، بوس و کنار، بزم آرائی و مجلس افروزی کے جذبات اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں وہ اس قسم کا عشق نہیں کرتے کہ کسی کے پیچھے زندگی برباد کر دیں گلیوں میں پڑے پھریں، ان کا عشق بھی لطف نظر ہے، اچھی صورت سامنے آئی دیکھ لی، دل تازہ ہوگیا، پاس بیٹھ گئے، ہم زبانی کا لطف اٹھایا، زیادہ پھیلے تو سینہ سے لگالیا، گلے میں باہیں ڈال دیں، اس حالت میں بھی کوئی بُرا خیال نہیں، پاکبازی اور پاک نظری کی روک قائم ہے، خود فرماتے ہیں:

منم کہ شہرۂ شہرم بہ عشق ورزیدن   منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

(بایں ہمہ عشق و محبت میں جو جو واردتیں گذرتی ہیں ایک ایک سے باخبر ہیں اور ان سب جذبات کو اسی سچائی اسی واقعیت اسی جوش کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں، جس طرح دل میں آتے ہیں اور یہی اصلی شاعری ہے) وہ کوئی بات نہیں کہتے جب تک کوئی جذبہ دل میں نہیں پیدا ہوتا، معشوق کی تعریف بھی جو شاعروں کا رات دن کا وظیفہ ہے کرنا چاہتے ہیں تو اسی وقت کرتے ہیں، جب معشوق کی کسی نئی ادا سے دل پر نئی چوٹ پڑتی ہے، ورنہ یوں کچھ کہہ جاتے ہیں تو اس کو

بیکار سمجھتے ہیں، خود فرماتے ہیں،

نکتۂ ناسنجیدہ گفتم دلبرا! معذور دار　　　عشوہ فرمائے تا من طبع را موزوں کنم

غنی نے اسی بات کو اپنے انداز میں کہا ہے،

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر فکر　　　تو خیالستی و من معنیٔ رنگیں بستم

خواجہ صاحب اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ عشق محض ظاہری حسن و جمال سے نہیں پیدا ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ عشق نہیں بلکہ ہوس پرستی ہے، عشق کیلئے معشوق میں حسن و جمال کے سوا اور بہت سی ادائیں ہونی چاہیئں، اسی نکتہ کو سلمان ساوجی نے بھی ادا کیا تھا۔

شاہد آن نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل　　　شاہد آن ست کہ این دارد و آنے دارد

لیکن سلمان نے آن کی تخصیص کر دی، خواجہ صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

شاہد آن نیست کہ موئے و میانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

لیکن یہیں تک بس نہیں کرتے بلکہ آگے بڑھتے ہیں

ہزار نکتہ در این کار و بار دلداری است　　　کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری است

عاشق جب عشق سے لطف اٹھاتا ہے تو عام فطرت انسانی کے لحاظ سے اوروں کو بھی اس مزہ کے اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے، اس جذبہ کو عجیب لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

مصلحت دید من آن است کہ یاران ہمہ کار　　　بگذارند و سر زلف نگارے گیرند

شہرے پر از حریفاں و ز ہر طرف نگارے　　　یاران صلائے عشق است گر می کنید کارے

اس مستی کو دیکھو کہ "یار کو کوئی کام کرنا ہے تو بس یہ (عشق) کرنے کا کام ہے،

عاشق کو جب وصل کا تصور آتا ہے، تو یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ معشوق کو طرح طرح سے آراستہ کروں گا، پھولوں کے زیور پہناؤں گا، تخت پر بٹھاؤں گا اور عرض کروں گا کہ معشوقانہ انداز سے بیٹھے اور تماشائیوں پر بجلی گرائے۔ ان جذبات کی تصویر دیکھو،

بہ تخت گل بنشانم بتے چو سلطانے　　　ز سنبل و سمنش ساز دادہ طوق و یارہ

چنبیلی زیور طوق کنگن

کرشمہ کن و بازارِ ساحری بشکن | بہ غمزہ رونقِ بازارِ سامری بشکن
بباد دہ سر و دستارِ عالمے یعنی (لوگوں کی پگڑیاں اچھال) | کلاہ گوشہ بہ آئینِ دلبری بشکن
چو عطرسائی شود زلفِ سنبل از دمِ باد | تو قیمتش بہ سرِ زلفِ عنبری بشکن
بہ زلف گوئی کہ آئینِ دلبری مگذار | بہ غمزہ گوئے کہ قلبِ ستمگری بشکن
برون خرام و ببر گوی خوبی از ہمہ کس | سزائے حور (نوخ) بدہ رونقِ پری بشکن

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ وصل میں دل کے کانٹے نکل جاتے ہیں اور تسکین ہو جاتی ہے لیکن صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ وصل میں آتشِ شوق اور بھڑکتی ہے اور دل کا ولولہ کسی طرح کم نہیں ہوتا، اسی بنا پر عرب کا شاعر کہتا ہے،

بِكُلٍّ تَدَاوَيْنَا فَلَمْ يُشْفَ مَا بِنَا | عَلیٰ اَنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَيْرٌ مِّنَ الْبُعْدِ

یعنی ہم سب کر کے دیکھ چکے کسی سے تسلی نہیں ہوتی تاہم ہجر سے وصل پھر اچھا ہے، خواجہ صاحب اس نکتہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت | و اندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت
گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست | گفت ما را جلوۂ معشوق در ایں کار داشت

معشوق نے چند روز سے بے وفائی برتی ہے، پھر صاف ہو گیا ہے، عاشق کو پچھلی باتیں یاد آتی ہیں لیکن قصداً بھلاتا ہے اور معشوق کو مطمئن کرتا ہے کہ مجھ کو کوئی شکایت نہیں، اتفاقیہ باتیں تھیں ہو گئیں، اس حالت کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

گر ز دستِ زلفِ مشکینت خطائے رفت رفت | ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

اس بلاغت کو دیکھو کہ ظلم و ستم کو معشوق کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ زلف کا نام لیتا ہے، اور اس کو ہندو (چور ظالم) کہتا ہے کہ اس سے یہ کیا بعید ہے،

برقِ عشق ار خرمنِ پشمینہ پوشے سوخت سوخت | جورِ شاہِ کامران گر بر گدائے رفت رفت

گر دلم از غمزۂ دلدار بارے برد برد درمیانِ جان و جاناں ماجرائی رفت رفت

کبھی عاشق کے دل میں یہ جذبہ اٹھتا ہے کہ معشوق کو اور لوگ بھی چاہتے ہوں گے لیکن میری سی جانبازی کون کر سکتا ہے، اس خیال کو محبت کے انداز سے معشوق کے سامنے بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

خواجہ صاحب اس جذبہ کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں،

شب مجنوں بہ لیلیٰ گفت کای معشوق بے ہمتا ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نخواہد شد

اس موقع پر مجنوں کے لفظ نے کیا بلاغت پیدا کی ہے، یہ مضمون سیکڑوں نے باندھا ہے، لیکن یہ پیرایہ کسی کو نصیب نہ ہوا۔

بعض وقت جب معشوق کا ناز اور تمکنت حد سے گذر جاتی ہے تو عاشق تنگ آکر کہہ دیتا ہے کہ اتنا بھی حد سے زیادہ نہ گذرے، دنیا میں ہزاروں صاحب جمال ہیں، معشوق بھی جانتا ہے کہ بات سچ ہے لیکن سمجھتا ہے کہ عاشق کے منصب کے خلاف ہے، ان سچے جذبات کو خواجہ صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں۔

صبحدم مرغِ چمن با گل نوخاستہ گفت ناز کم کن کہ دریں باغ بسی چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم ولے ہیچ عاشق سخنِ سخت بہ معشوق نگفت

عشق کے جذبات اگرچہ عالم شباب کے لئے خاص ہیں، لیکن بڑھاپے میں بھی یہ آگ سرد نہیں ہوتی، عاشق پر اس زمانہ میں مختلف حالات گذرتے ہیں، کبھی کہتا ہے،

ع رندی ہوسناکی در عہد شباب اولیٰ

کبھی خیال کرتا ہے کہ عشق کی گرمی خود جوان بنا دے گی، اس حالت میں کبھی معشوق سے کہتا ہے،

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر کہ سحرگہ ز کنار تو جوان برخیزم

کبھی کہتا ہے۔

هرچہ پیر و خستہ دل و ناتوان شدم　　هرگہ یاد روی تو کردم جوان شدم

اسی بنا پر کسی نے کہا ہے ع عشق در ایام پیری چو بہ سر آتش است،

ان خیالات کے ساتھ یہ کبھی سمجھتا ہے کہ یہ حالت عبرت انگیز ہے، اس حالت میں خود اپنی حالت پر افسوس کرتا ہے اور عبرت کے لہجہ میں کہتا ہے،

دیدی دلا کہ آخر پیری و زہد و علم　　با من چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من

یہ سب اصلی واردات ہیں جو عاشق کو پیش آتی ہیں، خواجہ صاحب نے ان کو بے کم و کاست ادا کیا ہے،

معشوق جب صاحب جاہ اور عاشق مفلس اور کم مایہ ہوتا ہے تو معشوق کو عاشق کی طرف التفات سے عار ہوتی ہے، لیکن عاشق میں یہ امتیاز ملحوظ نہیں، اس بنا پر قاصد سے خطاب کر کے کہتا ہے،

گر دیگرت بر آں در دولت گذر بود　　بعد از ادای خدمت و عرض دعا بگو

در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست　　اے بادشاہ حسن سخن با گدا بگو

غرض اس طرح کے سیکڑوں جذبات ہیں جن کو خواجہ صاحب نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اور جس کی مثال، اساتذہ کے کلام میں نہیں مل سکتی، ہم سرسری طور پر یکجائی چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

۱- معشوق کی نسبت بدگمانی۔

خواب آں نرگس فتان تو بے چیزے نیست　　تاب آں زلف پریشان تو بے چیزے نیست

۲- ظلم کے بعد معشوق کے رحم کی داد،

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب   کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

۳۔ رقیب سے چھپ کر سرگوشی،

خدا را اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ   کہ من با لعلِ جاں بخشش نہانی یک سخن دارم

۴۔ معشوق کی عام آمیزی کی شکایت،

زلف در دست صبا گوش بہ پیغام رقیب   ایں چنیں با ہمہ در ساختۂ یعنی چہ

۵۔ عشق سے پارسائی میں فرق آنے کا خطرہ،

می ترسم از خرابیِ ایماں کہ می برد   محرابِ ابروی تو حضورِ نمازِ من

۶۔ معشوق نے چارہ ساز ہو کر چارہ نوازی نہ کی،

چہ عذر از بخت خود گویم کہ آں عیارِ شہر آشوب   بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد

باکہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں سنگیں دل   کشت ما را و دمِ عیسیٰ مریم با اوست

۷۔ بوسے کے ساتھ گالی کا مزہ،

قند آمیختہ با گل نہ علاجِ دلِ ماست   بوسہ چندے بیامیز بہ دشنامے چند

۸۔ با وفا معشوق کی نظیر پیش کر کے معشوق سے التفات کی خواہش،

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند   اے دوست بیا رحم بہ تنہائیِ ما کن

۹۔ حیا اور رونے کی وجہ سے افشائے راز،

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز   وگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

۱۰۔ اوروں کی کامیابی پر حسرت،

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بہ یاد آر حریفانِ بادہ پیما را

۱۱۔ داستانِ عشق کی دلچسپی،

داستانِ عشق کی دلچسپی،

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق ایں عجب	از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است

12 - معشوق پر فدا ہونے کا انتظار اور اس کا اعراض،

می خواستم کہ میرمش اندر قدم چو شمع	او خود گذر بہ من چو نسیم سحر نہ کرد

13 - معشوق کی یاد میں شب گذاری کا لطف،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دمِ صبح	بوی زلفِ تو ہماں مونسِ جان است کہ بود

14 - معشوق نہ زر سے ہاتھ آتا اور نہ خود ملتفت ہوتا،

از بہر بوسۂ زلبش جاں ہمی دہم	اینم نمی ستاند و آنم نمی دہد

15 - اہلِ تقویٰ برا مانیں تو مانیں، شاہد پرستی نہیں چھوڑی جا سکتی،

شراب لعل کش و روی مہ جبیناں بیں	خلاف مذہب آناں جمال اینان بیں

فلسفہ خواجہ صاحب کا فلسفہ قریبًا وہی ہے جو خیام کا ہے، خواجہ صاحب نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل، زیادہ توضیح اور زیادہ جوش کے ساتھ ادا کیا ہے، چنانچہ ہم ان کو بدفعات بیان کرتے ہیں،

(۱) ان کا فلسفہ اس مسئلہ میں شروع ہوتا ہے کہ یہ انسان کو کائنات کے اسرار اور ان کی حقیقت کچھ معلوم نہیں، اور نہ معلوم ہو سکتی! اس مضمون کو سقراط، فارابی، ابن سینا، خیام سب نے بیان کیا تھا، لیکن خواجہ صاحب جس بلند آہنگی اور جوش و ادعا کے ساتھ کہتے ہیں، وہ ان کا خاص حصہ ہے،

برو ای زاہد خود بیں! کہ ز چشم من و تو	راز ایں پردہ نہان است و نہاں خواہد بود

انداز بیان کی بلاغت کو دیکھو! کلام کی ابتدا ایسے لفظ سے کی ہے، جس سے زاہد

کی دعویٰ رازدانی کی سخت تحقیر ظاہر ہوتی ہے، خود بیں کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ دعویٰ صرف خود بینی کی بنا پر ہوتا ہے، زاہد کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شریک کرلیا ہے، جس سے زاہد کی خاطرداری اور دعویٰ کی تعمیم مقصود ہے، یعنی اس امر میں عارف و زاہد، عالم و جاہل سب برابر ہیں، دوسرے مصرع میں ماضی کے ساتھ آئندہ زمانہ کو بھی داخل کرلینے سے دعویٰ میں زیادہ زور اور تعمیم پیدا ہوگئی ہے،

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں — کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

حدیث از مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نگشود و نگشاید بحکمت ایں معما

دانا چو دید بازیٔ ایں چرخ حقہ باز — ہنگامہ باز چید و در گفتگو ببست

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست — ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

ساقیا جام میم دہ کہ نگارندۂ غیب — نیست معلوم کہ در پردۂ اسرار چہ کرد

آں کس کہ پر نقش زد ایں دائرۂ مینائی — کس ندانست کہ در گردش پرکار چہ کرد

نشوی واقف یک نقطہ ز اسرار وجود — گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ دوراں را

در کارخانۂ کہ رہ عقل و علم نیست — وہم ضعیف رائے فضولی چرا کند

ما از بروں در شدہ مغرور صد فریب — تا خود دروں پردہ چہ تدبیر می کنند

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

راز درون پردہ چہ داند فلک خموش — اے مدعی نزاع تو با پردہ دار چیست

با ہیچ کس نشانے زاں دلستاں ندیدم — یا من خبر ندارم یا او نشاں ندارد

مردم ز انتظار و دریں پردہ راہ نیست — یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد

۲- شاہد مطلق کا ظہور اگرچہ ہر جگہ ہے اور ذرہ ذرہ میں اس کی جھلک موجود ہے

لیکن کوئی شخص کو پہچان نہیں سکتا،

(۳) اسرار کائنات اگرچہ حقیقت میں معلوم نہیں ہو سکتے، لیکن جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا ہے، وہ علوم درسیہ کی تحصیل اور بحث و مباحثہ سے نہیں معلوم ہو سکتا بلکہ مجاہدہ، ریاضت، وجدان اور کشف سے معلوم ہو سکتا ہے، خواجہ صاحب نے ارباب ذوق اور مشاہدہ کا نام ساقی، بادہ فروش، رند رکھا ہے، اور اسی بنا پر ہر جگہ پیر مغاں اور بادہ فروش کی حلقہ بگوشی کا دعویٰ کرتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں زہاد یعنی علمائے ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں،

راز درون پردہ ز رندان مست پرس ‏ ‏ کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

سر خدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت ‏ ‏ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ‏ ‏ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

اے کہ از دفتر عقل آیت عشق آموزی ‏ ‏ ترسم ایں نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست

سر ز حیرت بہ در میکدہ ہا بر کردم ‏ ‏ چوں شناسائی تو در صومعہ یک پیر نبود

حلاج بر سر دار ایں نکتہ خوش سراید ‏ ‏ از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

مرزا غالب نے اس خیال کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است ‏ ‏ بر دار تواں گفت، و بہ منبر نتواں گفت

(۴) صوفیہ کے نزدیک علم حاصل ہونے کا ذریعہ بیرونی چیزوں کا مطالعہ نہیں ہے ان کے نزدیک دل پہ جب ایک خاص طریقہ سے توجہ، اور مدت تک اس پر مواظبت کی جاتی ہے، دل خود ادراکات اور معلومات کا سرچشمہ بن جاتا ہے، جس طرح انبیاء کا علم باہر سے نہیں آتا، بلکہ فوارہ کی طرح اندر سے اچھلتا ہے، خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت پرجوش اور بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے۔

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست　　وندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم　　گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

یعنی میں نے ساقی (عارف) کو دیکھا کہ خوشی سے کھلا جاتا ہے، ہات میں شراب کا پیالہ ہے، اس کو بار بار دیکھتا ہے، اور اس میں اس کو گوناگوں عالم نظر آتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کارپرداز فطرت نے تم کو یہ جام جہاں بیں کس دن عنایت کیا تھا، بولا کہ جس دن یہ سبز گنبد (آسمان) تعمیر کر رہا تھا،

(۶) خواجہ صاحب کا میلان زیادہ تر جبر کی طرف معلوم ہوتا ہے، یعنی انسان خود مختار نہیں ہے نہ کوئی اور قوت ہے جو اس سے کام لے رہی ہے، اگرچہ بعض جگہ اس کے خلاف بھی ان کے قلم سے نکل جاتا ہے، مثلاً ع

ہر عمل اجرے و ہر کار جزائے دارد

لیکن ان کا اصلی رجحان طبع جبر ہی کی طرف ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر خلاف عقل ہے لیکن فلسفہ کی انتہائی منزل یہی ہے اور ارباب فنا بھی اسی نشہ میں چور ہیں، خواجہ صاحب جب اس عالم میں آتے ہیں تو ان کی سرمستی حد سے بڑھ جاتی ہے اور عجیب جوش و خروش کا عالم ہوتا ہے،

نقش مستوری و مستی نہ بدست من و تست　　آنچہ استاد ازل گفت، بکن آں کردم

بارہا گفتہ ام و بار دگر مے گویم　　کہ من دل شدہ ایں رہ نہ بخود می پویم

ہمدمی ناصح و بر دردکشاں خردہ مگیر　　کارفرمای قدر می کند ایں من چہ کنم

برق غیرت کہ چنیں می جہد از پردۂ غیب　　تو بفرما کہ من سوختہ خرمن چہ کنم

مرا مہر نکورویاں ز سر بیروں نخواہد شد ‏ قضائے آسمان است ایں و دیگرگوں نخواہد شد

مرا روز ازل کارے بجز رندی نفرمودند ‏ ہر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزوں نخواہد شد

مستور و مست ہر دو چو از یک قبیلہ اند ‏ ما دل بہ عشوہ کہ دہیم؟ اختیار چیست؟

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ‏ آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(۵) کمال اور ترقی کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں یہ غلط ہے کہ ؎

حریفاں بادہا خوردند و رفتند

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید ‏ دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

(۶) بندگانِ خاص کی فطرت ہی جدا ہوتی ہے، وہ بات ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی،

گوہر جام جم از طینتِ خاکِ دگر است ‏ تو توقع ز گِلِ کوزہ گراں میداری

فلسفۂ اخلاق خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم اعلیٰ درجہ کے فلسفۂ انسانیت کی تصویر ہے ان کا طرزِ عمل خود ان کی زبان سے یہ ہے،

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن ‏ کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

؎ فرض ایزد بگذاریم و بکس بد نہ کنیم

ما نہ گوئیم بد و میل بہ ناحق نہ کنیم ‏ جامۂ کس سیہ و دلق خود ازرق نہ کنیم

نہ صرف اچھوں بلکہ بروں کو بھی ہم برا کہنا پسند نہیں کرتے کیونکہ گو برے کو برا کہنا چنداں مضائقہ نہیں، پھر بھی برائی سے خالی نہیں، اس لیے سرے سے اس کام کو چھوڑ دینا بہتر ہے،

عیب درویش و توانگر بہ کم و بیش بد است ‏ کار بد مصلحت آن است کہ مطلق نکنیم

ہم اپنے نکتہ چینیوں اور مخالفوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتے اس لئے کہ اگر وہ حق کہتے ہیں تو حق

کے برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں، اور اگر غلط کہتے ہیں تو غلط بات کا کیا رنج،

حافظ از خصم خطا گفت نگیریم برو ور بحق گفت جدل با سخن حق نکنیم

ہماری مجلس عام ہے، کسی کی تخصیص نہیں، جو چاہے آئے، ہم سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں، واعظوں اور زاہدوں کی طرح ہمارا اخلاق دوست دشمن عزیز و بیگانہ، کافر و مسلمان کی تفریق کی وجہ سے بدلا نہیں کرتا،

هر که خواهد گو بیا و هر که خواهد گو برو گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاه نیست

بندهٔ پیر خراباتم که لطفش دائم است ورنه لطف شیخ و زاهد گاه هست و گاه نیست

ہم کو صرف مہر و محبت سے کام ہے، دشمنی، بغض اور کینہ ہمارا طرز عمل نہیں،

ما قصهٔ سکندر و دارا نخوانده ایم از ما بجز حکایت مهر و وفا مپرس

قفا خوریم و ملامت کشیم و خوش باشیم که در طریقت ما کافریست رنجیدن

به پیر میکده گفتم که چیست راه نجات بخواست جام می و گفت عیب پوشیدن

فرائض اور عبادات بہشت کے لالچ سے نہیں کرنی چاہییں بلکہ اس لئے کرنی چاہییں کہ فرض انسانی ہیں، بہشت بے شک معاوضہ میں ملے گی لیکن تمہارا مطمح نظر یہ نہیں ہونا چاہیے۔

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن که خواجه خود روش بنده پروری داند

من آن نگین سلیمان به هیچ نستانم که گاه گاه برو دست اهرمن باشد

مشہور ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی تاثیر سے تمام جن اور انسان ان کے تابع تھے، ایک دفعہ ایک شیطان نے اس کو کسی طرح اڑا لیا، حضرت سلیمانؑ کی سلطنت اور شان و شوکت سب جاتی رہی، یہاں تک کہ مچھلیاں بیچ کر زندگی بسر کرتے تھے، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جب

انگوٹھی پر کبھی کبھی شیطان کا قبضہ ہو جاتا ہے، میں اس کو کوڑی کے مول بھی نہیں خریدتا،

گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم — گر بہ آبِ چشمۂ خورشید دامن تر کنم

بہ خرمنِ دو جہاں سر فرو نمی آرند — دماغِ کبر گدایانِ خوشہ چیناں بیں

ما ملکِ عافیت نہ بہ لشکر گرفتہ ایم — ما تختِ سلطنت نہ بہ بازو گشادہ ایم

لیاقت جب تک نہ ہو بڑوں کی برابری نہیں کرنا چاہیئے،

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف — مگر اسبابِ بزرگی ہمہ آمادہ کنی

ذاتی لیاقت درکار ہے، خاندانی شرف کافی نہیں،

تاجِ شاہی طلبی گوہرِ ذاتی بنما — ور خود از گوہرِ جمشید و فریدوں باشی

تحصیلِ مقصد کے لئے کوشش درکار ہے،

در رہِ منزلِ لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں — شرطِ اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

ترغیبِ عمل،

اے دل بہ کوئ عشق گذارے نمی کنی — اسباب جمع داری و کارے نمی کنی

چوگاں بدست داری و گوئ نمی زنی — بازے چنیں بدست و شکارے نمی کنی

علماء اور واعظین کی پردہ دری | اخلاقی تعلیم اس بات پر موقوف ہے کہ شاعر فطرتِ انسانی کا نکتہ شناس ہو، جو عیب اور برائیاں کھلی کھلی ہوتی ہیں، ان کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے لیکن دقیق، مخفی اور سربستہ عیوب تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہونچ سکتی، اس لئے جو شاعر فلسفۂ اخلاق کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اس کے لئے فطرت کا نکتہ شناس ہونا سب سے پہلی شرط ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ لطیف اور دل آویز

طریقوں سے یہ عیوب ظاہر کیے جائیں تاکہ لوگوں کو گراں نہ گذریں بلکہ خود ان کو ان کے سننے میں لطف آئے، مخفی اور دقیق عیوب جس قدر علماء واعظین اور زہاد میں پائے جاتے ہیں کسی فرقہ میں نہیں پائے جاتے، چنانچہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، لیکن چونکہ یہ فرقہ ہمیشہ با اقتدار رہا ہے، اس لئے ان کے عیوب کا ظاہر کرنا آسان بات نہیں، امام غزالی نے اس کا جو نتیجہ اٹھایا، یہ تھا کہ ان کی جان تک معرض خطر میں آگئی؛ اس لئے کسی کو ہمت نہ ہوئی، شعراء میں سب سے پہلے خیام نے یہ جرأت کی، اس کے بعد شیخ سعدی نے دبی زبان سے کچھ کچھ کہا مثلاً

محتسب در قفائے رندان است — غافل از صوفیانِ شاہد باز

پردہ می بر درد از خانقہ یکے ہشیار۔ — کہ تا بہ شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

گر کنند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر — کیں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

لیکن جس دلیری، آزادی اور بے باکی سے خواجہ صاحب نے اس فرض کو ادا کیا آج تک کسی سے نہ ہوسکا۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس — توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

گوئیا باور نمی دارند روزِ داوری (قیامت) — کیں ہمہ قلب (کھوٹ) و دغا در کار داور (خدا) می کنند

دی دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت — بر درِ میکدہ با دف و نے ترسائے

گر مسلمانی این است کہ حافظ دارد — وای اگر در پسِ امروز بود فردائے

یعنی کل شراب خانہ کے دروازہ پر ایک عیسائی دف بجا کر یہ گاتا تھا کہ اگر اسلام اسی کا نام ہے جو حافظ میں پایا جاتا ہے تو آج کے بعد اگر کل قیامت کا دن بھی آنے

آنے والا ہے تو ہائے۔

اس شعر کا پیرایۂ بیان بھی کس قدر بلیغ ہے، اول تو جو کہنا ہے اس کو ایک عیسائی کی زبان سے کہا ہے جس سے علاوہ احتیاط کے مقصود یہ ہے کہ غیروں کو بھی ان بداعمالیوں پر افسوس اور رحم آتا ہے، گانے اور بجانے کے شامل کرنے سے یہ غرض ہے کہ اس ذریعہ سے لوگ زیادہ جی لگا کر سنتے تھے اور زیادہ تشہیر ہوتی تھی، اپنا نام لینے سے علاوہ احتیاط کے یہ مقصد ہے کہ دوسروں کا عیب کہتے تو ان کو توجہ نہ ہوتی،

سب سے بڑا عیب مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری کا ہوتا ہے، اس لئے نہایت دلیری سے ان کی برائیاں بیان کی ہیں،

اگرچہ بر واعظ شہر ایں سخن آساں نشود ٭ تا ریا ورزد و سالوس، مسلماں نشود

یعنی گو واعظ کو یہ بات گراں گذرے گی لیکن ہے یہ کہ جب تک وہ ریاکرتا رہیگا، مسلمان نہیں ہوسکتا،

غلامِ ہمت دردی کشاں یک رنگم ٭ نہ آں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیاہ اند
(ازرق: نیلا)

بادہ نوشے کہ درو ہیچ ریائے نبود ٭ بہتر از زہد فروشے کہ درو روی و ریاست

من از پیر مغاں دیدم کرامت ہائے مردانہ ٭ کہ ایں دلق ریائی را بہ جامے در نمی گیرد

مے خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب ٭ بہتر ز طاعتے کہ بہ روی و ریا کنند

ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست ٭ نانِ حلالِ شیخ ز آبِ حرامِ ما

بیا بمیکدہ و چہرہ ار نی کن ٭ مرو بہ صومعہ کاں جا سیاہ کارانند
(صومعہ: خانقاہ)

نقدہا را بود آیا کہ عیارے گیرند ٭ تا ہمہ صومعہ داراں پے کارے گیرند

یعنی اگر سکے پر گھے جاتے تو سب خانقاہ نشین اپنا اپنا راستہ لیتے۔

مولویوں اور واعظوں کو اس میں بڑا کمال ہوتا ہے کہ تقدس کے پردہ میں اس طرح ریاکاریاں کرتے ہیں کہ کسی کو ان کی نسبت گمان بھی نہیں ہو سکتا، خواجہ صاحب نے اس نکتہ کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

اے دل طریق مستی از محتسب بیاموز ‏ مست است و در حق او کس ایں گماں ندارد

خرقہ پوشان ہمگی مست گذشتند و گذشت[1] ‏ قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

صوفیان واستدند از گرو می ہمہ رخت (واپس لیا) ‏ دلق ما بود کہ در خانۂ خمار بماند

یعنی صوفیوں نے اپنا خرقہ شراب کے عوض میں رہن بھی کیا اور واپس بھی لے لیا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی، ہم رند، یوں رسوا ہوئے کہ ہمارا خرقہ رہن پڑا رہ گیا۔

داشتم دلقے و صد عیب مرا می پوشید ‏ خرقہ رہن مے و مطرب شد و زنار بماند

عیب چھپانے کی ایک بڑی گہری چال یہ ہے کہ کوئی اور شخص اگر وہ عیب کرتا ہوا نظر آئے تو نہایت سختی سے اس پر دار و گیر کی جائے اس راز کو خواجہ صاحب اس طرح فاش کرتے ہیں۔

بادہ با محتسب شہر نہ نوشی زنہار ‏ کہ خورد بادہ می و سنگ بہ جام اندازد

یعنی محتسب کے ساتھ کبھی شراب نہ پینا، وہ تمہارے ساتھ شراب بھی پئے گا اور تمہارا پیالہ بھی توڑ ڈالے گا۔

مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری علانیہ نظر آتی ہے اور مذہبی گروہ بھی اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتے، اس بنا پر خواجہ صاحب فرماتے ہیں،

می خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب ‏ چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

صوفیان جملہ حریف اند نظر باز و لے ‏ زاں ہمہ حافظ سودا زدہ بدنام افتاد

---

[1] یعنی گئی گذری بات ہوئی،

علماء کے اوصاف اور اخلاق پر خوب غور کرو، تو نظر آئیگا کہ عوام کی عقیدت مندی اور نیاز مندی کی وجہ سے ان میں نہایت عجب اور غرور پیدا ہو جاتا ہے، اور اس وصف کو اس لئے ترقی ہوتی جاتی ہے کہ ان کو یہ باتیں مذہبی پیرایہ میں نظر آتی ہیں، وہ کسی کو برا کہتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف کی تعمیل ہے، سلاطین اور حکام کی دربارداری کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی کے اجراء کے لئے اس کی ضرورت ہے، کسی سے ذاتی عناد کی وجہ سے دشمنی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ بغض ... ہے، غرور اور فخر کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ عزت نفس ہے، اس بناء پر یہ تمام عیوب ان میں راسخ ہوتے چلے جاتے ہیں، خواجہ صاحب ان تمام عیبوں کی نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں پردہ دری کرتے ہیں،

اگر از پردہ بیرون شد دل من عیب مکن　　شکر ایزد کہ نہ در پردۂ پندار بماند

در رہ ما شکستہ دلی می خرند و بس　　بازار خود فروشی ازاں راہ دیگر است

یعنی ہمارے بازار میں صرف خاکساری کی قیمت ہے، باقی خود پرستی تو اس کا راستہ دوسری طرف ہے،

زاہد شہر چو مہر ملک و شحنہ گزید　　من اہم از مہر نگارے بگزیدم چہ شود

یعنی جب زاہد نے بادشاہ پرستی اختیار کی، تو ہم بھی اگر کسی خوبصورت سے دل لگائیں تو کیا حرج ہے، یعنی بادشاہ پرستی سے شاہد پرستی بہتر ہے،

عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو　　نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

علماء کی عام حالت یہ ہے کہ امر حق کو عوام کی خاطر سے کبھی ظاہر نہیں کرتے بلکہ اگر اس میں کوئی برائی کا پہلو ہے تو صرف اسی پر زور دیتے ہیں، آج کل مغربی تعلیم قوم کیلئے کس قدر ضروری اور گویا شرط زندگی ہے، لیکن صرف اس وجہ سے کہ عوام اس سے وحشت

کرتے ہیں کبھی کوئی عالم اس کی ترغیب نہیں دے سکتا بلکہ ہمیشہ اس کی مخالفت کیجاتی ہے، خواجہ صاحب نے نہایت موثر طریقے سے اس عیب پر ملامت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ عوام کی خاطر سے حکمت اور حقیقت سے انکار نہ کرو، شراب میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی اور نقصان فائدہ سے زیادہ ہے تاہم خدا نے قرآن مجید میں فرمایا فیهما اثم کبیر ومنافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما یعنی قمار اور شراب میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی، لیکن نقصان زیادہ ہے، جب خدا نے باوجود اس کے کہ شراب نہایت بری چیز ہے اس کے فائدوں کو چھپانا نہیں چاہا البتہ یہ بتادیا کہ فائدہ سے نقصان زیادہ ہے اور اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے تو امر حق کو عوام کی خاطر سے چھپانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے،

خواجہ صاحب نے اس بات کو جابجا نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں ادا کیا ہے کہ مولویوں اور واعظوں کی نیکیاں بھی چونکہ ذاتی غرض پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے درگاہ الٰہی میں مقبول ہونے کے قابل نہیں،

درمیخانہ ببستند خدایا مپسند
که در خانۂ تزویر و ریا بکشایند

ترسم که صرفۂ نبرد روز بازخواست
نانِ حلالِ شیخ زآبِ حرامِ ما

ای خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولیٰ
ویں دفترِ بے معنی، غرقِ مےِ ناب اولیٰ

روزمرہ و محاورہ (خواجہ صاحب کی فصاحت کلام کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں کلام میں روزمرہ اور محاورے نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو الفاظ اور ترکیبیں رات دن استعمال میں آتے رہتے ہیں اور جن سے روزمرہ پیدا ہوتا ہے، عموماً وہی ہوتے ہیں جو فصیح، سلیس، نرم اور رواں ہوں، اور اگر ان میں کسی قدر کمی ہوتی ہے تو وہ روزمرہ کے استعمال سے نکل جاتی ہے، کیونکہ رات دن سنتے سنتے وہ الفاظ کانوں کو مانوس ہو جاتے ہیں، محاورات کا بھی یہی حال ہے، محاورہ اُس وقت بنتا ہے جب ایک گروہ کا گروہ کسی جملہ کو کسی خاص معنی میں استعمال

کرتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ جملہ خود فصیح، سلیس اور رواں ہو، ورنہ محاورہ عام میں نہیں آسکتا،

ایک اور پہلو سے اس خصوصیت پر نظر ڈالو، فارسی زبان میں مفرد الفاظ بہ نسبت اور زبانوں کے نہایت کم ہیں، اس کمی کی تلافی زبان نے محاورات اور مصطلحات سے کی ہے، شاعری کے لئے زبان پر قدرت تام حاصل ہونا سب سے ضروری شرط ہے، خواجہ صاحب کی قادرالکلامی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے جس قدر محاورات اور مصطلحات برتے، فارسی شعراء میں سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور یہ ان کی قادرالکلامی کی ایک بڑی دلیل ہے۔)

(خواجہ صاحب کا تمام کلام اگرچہ روزمرہ محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے لیکن مثال کے طور پر ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں[1])

ترسم کہ صرفہ نبرد روز بازخواست (قیامت)	نانِ حلالِ شیخ ز آبِ حرام (شراب) ما
صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا	ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا
عنقا شکار کس نشود دام باز چیں	کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را
اے صبا گر بجوانانِ چمن باز رسی	خدمتِ ما برساں سرو و گل و ریحاں را
ترسم آں قوم کہ بر دُرد کشاں می خندند	در سرِ کارِ خرابات کنند ایماں را

---

[1] جو محاورات ان اشعار میں آئے ہیں ان کے معنی ہم یکجائی لکھدیتے ہیں،
صرفہ بردن بازی لیجانا، دام باز چیدن، جال کو سمیٹ لینا، باد بدست بودن، کچھ ہاتھ نہ آنا، خدمت رسانیدن سلام، در سرِ کارے کردن، صرف کردینا یا لگا دینا،

برو بکار خود ای واعظ این چه فریاد است — مرا فتاده دل از کف ترا چه افتاده است[۱]

روی خوب است و کمال هنر و دامن پاک — لاجرم همت[۲] مردان دو عالم با اوست

هر چه هست از قامت ناساز بی اندام[۳] ماست — ورنه تشریف تو بر بالای کس کوتاه نیست

بندهٔ پیر خراباتم که لطفش دائم است — ورنه لطف شیخ و زاهد گاه هست و گاه نیست

دانا چو دید بازی این چرخ حقه باز — هنگامه باز چید و در گفتگو ببست

در راه ما شکسته دلی می‌خرند و بس — بازار خود فروشی از آن راه دیگر است[۴]

اگرچه باده فرح‌بخش و باد گل‌بیز است — به بانگ چنگ مخور می که محتسب تیز است[۵]

می‌خواست گل که دم زند[۶] از رنگ و بوی دوست — از غیرت صبا نفسش در دهان گرفت[۷]

آسوده بر کنار چو پرگار می‌شدم — دوران چو نقطه عاقبتم در میان گرفت[۸]

فرصت نگر که فتنه در عالم اوفتاد — عارف به جام می زد[۹] و از غم کران گرفت

حافظ چو آب لطف ز نظم تو می‌چکد — غیری چگونه نکته تواند بر آن گرفت[۱۰]

مستم کن آن چنان که ندانم ز بیخودی — در عرصهٔ خیال که آمد کدام رفت

در حق من لبت این لطف که می‌فرماید — سخت خوب است و لیکن قدری بهتر از این

همای همتم عمری ست کز جان — هوای[۱۱] آن قد و بالا گرفته است

دلم جز مهر مه‌رویان طریقی بر نمی‌گیرد — ز هر در می‌دهم پندش و لیکن در نمی‌گیرد[۱۲]

---

۱ ترا چه افتاده [illegible] تم کو کیا پڑی ہے، ۲ ہمت، توجہ اور ہمدردی، ۳ بے اندام بے ڈول، ۴ از آن راہ دیگر است یعنی اس کا راستہ ہے ۵ تیز، چھیلا اور غصہ ور، ۶ دم زدن، دعوی کرنا ۷ نفس در دہاں گرفتن، دم گھٹنا ۸ درمیان گرفتن گھیر لینا ۹ زدن کسی چیز پر لوٹ کر گرنا ۱۰ نکتہ گرفتن اعتراض کرنا ۱۱ ہوا گرفتن، ہوا میں اڑنا ۱۲ درگرفتن اثر کرنا یا لگ جانا۔

رخ و چشمے بایں خوبی تو گوئی دل از دلبر گیر — پر کین و عتاب ای معنی مرا در سر می گیرد
میان گریہ می خندم کہ چوں شمع اندریں مجلس — زبان آتشینم ہست لیکن در نمی گیرد
بدیں شعر تر شیریں ز شاہنشہ عجب دارم — کہ سرتاپای حافظ را چرا در زر نمی گیرد
یا وفا یا خبر وصل تو یا مرگ رقیب — بازی چرخ ازیں یکدو سہ کاری بکند
نقد ہا را بود آیا کہ عیارے گیرند — تا ہمہ صومعہ داران پے کاری گیرند
خرقہ پوشان ہمگی مست گذشتند و گذشت — قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند
مطرب عشق عجب ساز و نوائے دارد — نقش ہر پردہ کہ زد راہ بجائے دارد
از راہِ نظر مرغ دلم گشت ہوا گیر — اے دیدہ نظر کن کہ بدام کہ در افتاد
بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات — با درد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد
چہ مستی است ندانم کہ رو بما آورد — کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد
رسیدن گل و نسریں بخیر و خوبی باد — بنفشہ شاد و خوش آمد سمن صفا آورد
ز دیدہ خون دل ہمہ بر روئے ما رود — بر روئے ما ز دیدہ ندانم چہا رود
من و انکار شراب ایں چہ حکایت باشد — غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد
آں شد اے خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی — کار ما با رخ ساقی و لب جام افتاد
دل آرام نبود اے مرید خرابات — شاد و شیخی کہ خانقاہ ندارد

۱؎ در گرفتن، سونے میں تلوار دینا ۲؎ پے کاری گرفتن، کسی کام کے پیچھے پڑنا، لیکن ایسے موقعوں پر اپنا راستہ لینا، کے معنی آتا ہے ۳؎ گذشت، گئی گذری بات ہوئی ۴؎ راہ بجائی دارد، اصول اور قاعدہ کے موافق ہے ۵؎ درافتادن، الجھنا ۶؎ صفا آورد، خیر مقدم کے وقت کہتے ہیں ۷؎ چہا رود، کیسے گذرے گی ۸؎ شادی شیخی یعنی ان کے آفریں۔

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد ‏ ‏ زدیم بر صف رنداں و ہرچہ بادا باد

یارب بوقت گل گنہ بندہ عفو کن ‏ ‏ وین ماجرا بہ سرو لب جویبار بخش

حاشا کہ من بموسم گل ترک می کنم ‏ ‏ من لاف عقل میزنم این کار کے کنم

ای مگس عرصۂ سیمرغ نہ جولانگہ تست ‏ ‏ عرض خود می بری و زحمت[1] ما می داری

دردمندان بلا زہر ہلاہل نوشند ‏ ‏ قتل این قوم خطا باشد ہاں تا نکنی[2]

اکثر محاورے ایسے ہیں جو صرف بول چال اور بے تکلفی میں استعمال ہوتے ہیں، اہل قلم یہ سمجھ کر کہ وہ متانت کے خلاف ہیں، تصنیفات میں استعمال نہیں کرتے، مثلاً اردو میں یہ محاورات جاؤ بھی، رہنے بھی دیجئے، دیکھ لیا، وغیرہ وغیرہ روزمرہ استعمال میں آتے ہیں، لیکن ناسخ، خواجہ درد، سودا، وغیرہ ان کو نظم کی متانت کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن اس سے زبان کی وسعت گھٹتی ہے، اس لئے جن شعراء کو زبان کا خیال زیادہ ہے، مثلاً داغ وغیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ تمام محاورات لاتے ہیں۔ فارسی میں روزمرہ اور محاورہ کو خواجہ صاحب نے وسعت دی، ان کے کلام میں ایسے بہت سے محاورات ملیں گے جو کسی اور کے کلام میں نہیں مل سکتے، یہاں تک کہ بول چال کے لحاظ سے وہ محاورات بھی خواجہ صاحب نے لئے ہیں جو خاص لہجہ کے محتاج ہیں اور بغیر اس لہجہ کے سمجھ میں نہیں آسکتے مثلاً۔

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق ‏ ‏ گفتم اے خواجۂ عاقل! ہنرے بہتر ازیں

"ہنرے بہتر ازیں" کو ایک خاص لہجے سے پڑھنا چاہیئے جس سے استفہام کے معنی پیدا ہوں یعنی کیا اس سے بڑھکر کوئی اور ہنر ہوگا؛ یا مثلاً یہ ؎

کنار و بوسہ دہد صلحش چگویم چوں نخواہد شد

---

[1] زحمت کسے بر داشتن، کسی کو ایک ستانا [2] ہاں تا نکنی، دیکھو ایسا نہ کرنا،

یعنی عیب یہ ہونا نہیں ہے تو اس کا ذکر کیا کروں، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں،

خوش نوائی صاحب ذوق صاف محسوس کرتا ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام میں ایک خاص قسم کی خوش گواری پائی جاتی ہے، شاعری میں موسیقی بھی شامل ہے، اس لئے جو شعر موسیقی اور خوش نوائی سے الگ ہوگا، شاعری کے رتبہ سے گھٹا ہوگا، خواجہ صاحب کے کلام میں یہ وصف مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اکثر وہ غزلوں کی بحریں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں، شعروں کے ارکان اور ان کے ٹکڑے ایسے لاتے ہیں جو تال اور سم کا کام دیتے ہیں، اس غرض کے لئے اکثر ہم وزن الفاظ کا پے در پے آنا مدد دیتا ہے اور گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تان آکر ٹوٹتی ہے، مثلاً

چہ دستست رود خوش بزن مطرب سرود خوش	کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم
یکے از عقل می لافد دگر طامات می بافد	بیا کیں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد	من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم
شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزیم	نسیم عطر گرداں را شکر در مجمر اندازیم
سرو روان من چرا میل چمن نمی کند	ہمدم گل نمی شود، یاد وطن نمی کند
درد ما از یار ست و درماں نیز ہم	دل فدائے او شد و جاں نیز ہم
گر ز دست زلف مشکینت خطائی رفت رفت	ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے، قدماء کے کلام میں صنائع لفظی یعنی صنعت اشتقاق، ترصیع، ایہام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، مراعات النظیر (تناسب لفظی) جو حد سے گذر کر ضلع جگت بن جاتی ہے، سلمان ساؤجی نے رواج دیا اور کچھ زمانہ تک بڑے زور و شور سے جاری رہی، ان صنعتوں کو عموماً شعراء نے محض صنعت

کی حیثیت سے استعمال کیا یعنی اس لحاظ سے کہ اس کا التزام وقت آفرینی ہے اور وقت آفرینی ایک کمال کی بات ہے، اس عام رو سے خواجہ صاحب بھی نہ بچ سکے، چنانچہ مراعات النظیر اور ایہام و طباق ان کے ہاں بھی جا بجا پائے جاتے ہیں، مثلاً

تا دلِ ہرزہ گرد من رفت بہ چینِ زلفِ او　　زاں سفرِ دراز خود قصدِ وطن نمی کند

سحر انما ز سخن طے کنم شراب کجا است　　بدہ بہ شادیِ روحِ روانِ حاتم طے

ع نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما

لیکن خواجہ صاحب نے زیادہ تر ان لفظی صنعتوں کو لیا ہے جن سے خوش آہنگی اور خوش نوائی پیدا ہوتی ہے، مثلاً،

اے کہ می گوئید آں بہتر ز حسن　　یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس شعر میں این و آں کا جو مقابلہ ہے اس کو ایک سطحی النظر یہ خیال کرے گا کہ مراعات النظیر یا صنعتِ اضداد ہے لیکن ایک صاحبِ ذوق سمجھ سکتا ہے کہ ان دو لفظوں کی آواز کا تناسب ایسا ہے جو خود بخود کانوں کو خوش معلوم ہوتا ہے اور موسیقی کی حیثیت سے دیکھیں تو گویا گیت کے اجزا ہیں، مثلاً

قاصدِ حضرتِ سلمیٰ کہ سلامت بادا　　چہ شود گر بہ سلامے دلِ ما شاد کند

اس میں سلمیٰ سلامت اور سلام جو ملتے جلتے الفاظ آئے ہیں اُن سے عام آدمی کو صنعتِ اشتقاق کا خیال پیدا ہوگا، لیکن اصل میں یہ تناسبِ الفاظ ذرا ذرا سے فاصلہ پر بار بار آ آ کر کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتے ہیں، یا مثلاً

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی　　خدمتِ ما برساں سرو و گل و ریحاں را

اس شعر میں سرو و گل و ریحاں جو الفاظ آئے ہیں، عام لوگ اس کا نام مراعات النظیر

یا صنعتِ اعداد وغیرہ رکھیں گے، لیکن اس شعر کی بحر اور اس میں خاص ان متناسب الوزن الفاظ کا اخیر میں آنا ایک خوش نوائی پیدا کرتا ہے، جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھی، حالانکہ یہ ممکن تھا کہ وہ صنعتیں باقی رہتیں،

خواجہ صاحب کے کلام میں جہاں اس قسم کی صنعتیں نظر آئیں غور سے دیکھو تو ان میں دراصل خوش نوائی اور خوش آہنگی کا وصف ملحوظ ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

انگاشتہ نیست بر دورِ جہاں　　بلکہ بر گردشِ گرداں نیستم ہم

از بہر بوسۂ لبش جاں ہمی دہم　　اینم ہمی ستاند و آنم نمی دہد

شیوۂ ناز تو شیریں خط و خالِ تو ملیح　　چشم و ابروی تو زیبا قد و بالای تو خوش

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکناباد و گلگشتِ مصلّا را

گر دستِ زلفِ مشکینت خطای رفت رفت　　ور ہندوی شما بر من جفای رفت رفت

برقِ عشق از خرمنِ پشمینہ پوشے سوخت سوخت　　جورِ شاہِ کامراں گر بر گدائے رفت رفت

گر دلم از غمزۂ دلدار بارے برد برد　　درمیانِ جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

غور کرو ان اشعار میں جہاں جہاں مکرر الفاظ آئے ہیں کس قدر کانوں کو خوش معلوم ہوتے ہیں، ظاہر بیں اسکو صنعتِ تکرار کہہ دیگا لیکن کیا ہر جگہ کسی لفظ کا مکرر آنا کوئی لطف پیدا کرتا ہے،

کارواں رفت و تو در خوابی و بیاباں در پیش　　کے روی؟ رہ ز کہ پرسی؟ چہ کنی؟ چوں باشی؟

مصرعِ اخیر میں تم کو خیال ہوگا کہ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ پے در پے سوالات کئے ہیں، جس سے صنعتِ استفہام پیدا ہوگئی ہے، لیکن اس سے قطعِ نظر کرکے دیکھو یہ الفاظ کس طرح کانوں کو ایک خاص متناسب کھٹکا دیتے ہیں اور خوش آیند معلوم ہوتے ہیں۔

خدارا رحمی اے منعم کہ درویش سر کویت — درے دیگر نمی داند رہ دیگر نمی گیرد

بندش کی چستی | بندش کی چستی ایک وجدانی چیز ہے، اس کی تعریف اور تحدید نہیں ہو سکتی، لیکن مذاق صحیح آسانی سے اس کا احساس کرتا ہے، مثلاً ان اشعار میں باوجود اتحاد مضمون اور الفاظ کے، بندش کی چستی کا جو فرق ہے ہر شخص محسوس کر سکتا ہے،

سلیم: مشاطہ را جمال تو دیوانہ می کند — کائینہ را خیال پری خانہ می کند

صائب: دل را نگاہ گرم تو دیوانہ می کند — آئینہ را رخ تو پری خانہ می کند

غنی: ہر کس کہ دید روی تو دیوانہ می شود — آئینہ از رخ تو پری خانہ می شود

صائب: سرچشمۂ حیات لب میگون اوست — عمر دوبارہ سایۂ سرو روان اوست

فطرت: عیش ابد بہ کام دل دردمند تست — عمر دوبارہ سایۂ سرو بلند تست

صائب: ہمیشہ صاحب طول امل غمیں باشد — کہ چین بقدر بلندی در آستیں باشد

بیدل: دستگاہ ہر قدر بیش است کلفت بیشتر — در خور طول است چین جائے کہ دارد آستیں

خواجہ صاحب جیسا کہ خود انھوں نے متعدد موقعوں پر تصریح کی ہے کہ سلمان اور خواجو کی غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں، ان غزلوں کے مقابلہ کرنے سے بندش کے زور اور چستی کا فرق صاف نظر آجاتا ہے،

سلمان	حافظ
ہمچناں مہر تو ام مونس جان است کہ بود	گوہر مخزن اسرار ہمان است کہ بود
ہمچناں ذکر تو ام ورد زبان است کہ بود	حقۂ مہر بداں مہر و نشان است کہ بود

"مونس جان" کے قافیہ کے جواب میں خواجہ صاحب کا شعر ہے،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح — بوی زلف تو ہماں مونس جان است کہ بود

سلمان	حافظ
شوقم افزوں شد و آرام کم و صبر نماند	عاشقاں بندۂ ارباب امانت باشند
در فراقِ تو دلے عہد ہماں ست کہ بود	لاجرم چشمِ گہربار ہماں است کہ بود

اس شعر میں سلمان کی بندش کی سستی صاف ظاہر ہے "در فراقِ تو" کا موقع پہلے مصرع کی ابتدا میں ہے وہاں سے الگ ہو کر دلے کے ساتھ اس کی ترکیب بالکل بے مزہ ہو گئی ہے،

سلمان	حافظ
کے بود کے کہ بگویند سراسر اغیار	طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
کہ فلاں یار ہماں یارِ فلان است کہ بود	ہمچناں در عملِ معدن و کان است کہ بود
در ازل عکسِ مئ لعلِ تو در جام افتاد	عکسِ روی تو چو در آئینۂ جام افتاد
عاشقِ سوختہ دل در طمعِ خام افتاد	عارف از پرتوِ می در طمعِ خام افتاد

جام کے قافیہ میں حافظ کے اور اشعار ملاحظہ ہوں،

آں شد ای خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی | کار من با رخِ ساقی و لبِ جام افتاد

سلمان	حافظ
عشق بر کشتنِ عشاق تفاؤل می کرد	صوفیاں جملہ حریف اند و نظر باز ولے
پس قرعہ کہ زد بر منِ بدنام افتاد	زاں میاں حافظ شود ازدہ بدنام افتاد
خالِ مشکینِ تو در عارضِ گندم گوں دید	در خمِ زلفِ تو آویخت دل از چاہِ زنخ
آدم آمد ز پے دانہ و در دام افتاد	آہ کز چاہ بروں آمد و در دام افتاد

ان اخیر کے دونوں شعروں کے مقابلہ سے بندش کی چستی کا مفہوم تم کو علانیہ واضح ہو جائے گا، سلمان کا شعر اگرچہ معنی کے لحاظ سے بالکل ناموزوں ہے، چہرہ کو دام سے

کوئی مناسبت نہیں، بخلاف اس کے خواجہ صاحب نے ذقن کو چاہ اور زلف کو دام کہا ہے اور یہ عام مسلّمہ تشبیہہ ہے لیکن سلمان کے شعر میں بندش کی جو چستی ہے، خواجہ صاحب کے شعر میں نہیں ہے، ع آدم آمد زپے دانہ و در دام افتاد۔ آدم، دانہ، دام۔ یہ الفاظ ایسی ترتیب اور خوب صورتی اور روانی سے جمع ہو گئے ہیں کہ مصرع میں نہایت برجستگی پیدا ہو گئی ہے، خواجہ صاحب کا مصرع پھس پھسا ہے، اور خصوصًا آہ کے لفظ نے مصرعہ کو بالکل کم وزن کر دیا ہے،

سلمان

دام زلفِ تو بہر حلقہ طنابے دارد
چشمِ مستِ تو بہر گوشہ خرابے دارد
خونِ چشمِ من ازاں ریخت کہ تا ظن نبرم
کہ برش مردمِ صاحب نظر آبے دارد
رسنِ زلفِ تو سر رشتۂ جانِ من و شمع
ہر یک از آتشِ رخسارِ تو تابے دارد
آں کہ زا برو و مژہ تیر و کمانے دارد
چشم ہا کردہ سیہ قصدِ جہانے دارد

حافظ

آں کہ از سنبلِ او غالیہ تابے دارد
باز با دل شدگان ناز و عتابے دارد
چشمِ من کرد بہر گوشہ رواں سیلِ سرشک
تا سہی سروِ ترا تازہ بہ آبے دارد
ماہ و خورشید نمایش ز پسِ پردۂ زلف
آفتابیست کہ در پیشِ سحابے دارد
شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

ان مقابلوں سے بندش کی چستی اور زور کا مفہوم اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا، اب خواجہ صاحب کے اشعار ذیل کو اس نظر سے دیکھو،

آں شمع سرگرفتہ دگر چہرہ برفروخت　　واں پیر سالخوردہ جوانی ز سر گرفت
آں عشوہ داد عشق کہ مفتی ز رہ برفت　　واں کرد دوست کہ دشمن حذر گرفت

زنہار زاں عبارتِ شیرینِ دل فریب — گوئی کہ پستۂ تو سخن در شکر گرفت
من ایستادہ تا کنمش جاں فدا چو شمع — او خود گذر بما چو نسیمِ سحر نکرد
ماہی و مرغ دوش نخفت از فغانِ من — واں شوخ دیدہ بیں کہ سر از خواب بر نکرد
بالا بلند عشوہ گر سرو نازِ من — کوتاہ کرد قصۂ زہدِ درازِ من
دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست — وندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم — گفت آں روز کہ ایں گنبدِ مینا می کرد
زلفش سیہ خم بہ خم اندر زدہ باز — بختِ من شوریدہ بہم بر زدہ باز
بر شیشۂ صبرم زدہ سنگ و لیکن — با تو چہ تواں گفت کہ ساغر زدہ باز

ہمارے نزدیک حسنِ کلام کا بڑا جوہر یہی حسنِ بندش ہے،

جاحظ کا قول ہے کہ مضمون بازاریوں تک کو سوجھتے ہیں، جو کچھ فرق اور امتیاز ہے لطفِ ادا اور بندش کا ہے، سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک مضمون کسی شاعر نے باندھا، بعینہٖ وہی مضمون دوسرے نے باندھا، الفاظ تک اکثر مشترک ہیں، لیکن لفظوں کے الٹ پھیر اور ترتیب سے وہی مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا،

شوخی و ظرافت | خواجہ صاحب کے کلام میں جا بجا شوخی اور ظرافت بھی ہے لیکن نہایت لطیف اور نازک ہے، شیخ سعدی اور خیام بھی ظرافت کرتے ہیں، لیکن زیادہ کھل جاتے ہیں، خواجہ صاحب کی شوخیِ طبع کی لطافت دیکھو،

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند — قولِ ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست

یعنی واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، اس قدر تو ہمکو بھی تسلیم ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے، رہا تو فرشتہ ہے یا شیطان اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا،

بہ کوی می فروشانش بہ جامے در نمی گیرند — زہی سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد

گر ز مسجد بہ خرابات شدم عیب مگیر — مجلس وعظ دراز است زماں خواہد شد

یعنی میں اگر مسجد سے اٹھ کر شراب خانہ میں چلا گیا، تو اعتراض کی کیا بات ہے وعظ تو ابھی دیر تک ہوتا رہیگا، میں پی کے چلا آؤں گا،

اسی مضمون کو قائمؔ نے اردو میں ادا کیا ہے،

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائمؔ — یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

حافظ

محتسب خم شکست و بنده سرش — السن بالسن والجروح قصاص

قرآن مجید میں قصاص کی آیت میں مذکور ہے کہ زخم کا بدلہ زخم ہے، مثلاً اگر کوئی کسی کا دانت توڑ ڈالے تو اس کا بھی دانت توڑ ڈالا جائیگا،

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ محتسب نے خم شراب کو توڑ ڈالا تھا، میں نے قصاص کے حکم کے موافق اس کا سر توڑ دیا،

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت — ناخلف باشم اگر من بہ جوی نفروشم

میرے باپ (حضرت آدمؑ) نے بہشت کو گیہوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا تھا، میں اگر ایک جو کے بدلہ میں نہ بیچوں تو ناخلف ہوں،

من و انکار شراب! ایں چہ حکایت باشد — غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

میں اور شراب کا انکار! غالباً مجھے تو اتنی ہی عقل کافی ہے، یعنی یہ سمجھ لوں کہ شراب چھوڑنا مجھکو زیبا نہیں، اس سے زیادہ عاقل اور دور اندیش ہونا مجھکو ضرور نہیں،

نہ من ز بے عملی در جہاں ملولم و بس — ملامت علما ہم ز علم بے عمل است

میں بیکاری سے (یعنی شراب وغیرہ کا شغلہ نہیں ہے) دل گرفتہ ہوں، بے عمل ہونا برا ہے، اسی لئے عالم بے عملی بھی اچھا نہیں ہوتا،

نقد دلے کہ بود مرا صرف بادہ شد ۔۔۔ قلب سیاہ بود بہ جائے حرام رفت

قلب دل کو بھی کہتے ہیں اور کھوٹے سکہ کو بھی، اس بنا پر کہتے ہیں کہ میرا قلب اگر شراب میں صرف ہوا تو ہونا ہی چاہئے، ع مالِ حرام بود بجائے حرام رفت

تسلسل مضامین ایشیائی غزل گوئی کا ایک بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی خیال کو مسلسل نہیں ظاہر کر سکتے، ہر غزل متعدد اور مختلف بلکہ متناقض مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے، غزل کے جو مہمات مضامین ہیں، مثلاً حسن و عشق، سراپائے معشوق، وصل و ہجر، ہزاروں دفعہ بندھے ہیں لیکن ان میں سے کسی مضمون کی نسبت کوئی مسلسل اور تفصیلی بیان کہیں نہیں مل سکتا، اگرچہ حقیقت میں یہ چنداں اعتراض کی بات نہیں، مسلسل خیالات کے لئے مثنوی کی صنف متعین کر دی گئی ہے، قصائد اور قطعات سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے، غزل اس ضرورت کے لئے خاص کر دی گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات جو شاعر کے دل میں آتے رہتے ہیں، ضائع نہ جانے پائیں، اس صنف کے لئے نہایت قادر الکلامی درکار ہے، یورپ کو اپنی شاعری پر ناز ہے لیکن وہ کسی خیال کو دو چار شعروں سے کم میں نہیں ادا کر سکتے، بخلاف اس کے ہمارے شعراء نہ صرف چھوٹی چھوٹی باتیں بلکہ نہایت وسیع اور بڑے بڑے مضامین کو بھی ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں، جو اختصار کی وجہ سے فوراً زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جو نہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے مثنوی یا قصائد کی وسعت درکار ہو، نہ اتنے مختصر کہ ایک

دو شعروں میں سما جائیں، اسلئے اس قسم کی مضامین کے لئے غزلیں ہی مناسب ہیں، اس صورت میں ضرور ہے کہ غزل مسلسل ہو (یعنی پوری غزل یا غزل کے متعدد اشعار ایک ہی مضمون کے لئے خاص کر دیے جائیں، اس قسم کی غزلوں کا رواج اگرچہ عام نہیں ہوتا ہم بعض بعض پائی جاتی ہیں) اور سب سے پہلے خواجہ صاحب نے اس کو ترقی دی، ان کی اکثر غزلوں میں ایک خاص خیال یا ایک خاص سماں دکھایا گیا ہے، اس قسم کی چند غزلوں کے مطلع ہم نقل کرتے ہیں،

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند　　وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشایند　　گرہ از کارِ فروبستۂ ما بکشایند

بامداداں کہ بہ خلوت گہِ کاخِ ابداع　　شمعِ خاور فگند بر ہمہ اطرافِ شعاع

ای پیکِ پی خجستہ چہ نامی فدیت لک　　ہرگز سیاہ چردہ ندیدم بہ این نمک

گر دستِ زلفِ مشکینت خطای رفت رفت　　ور ز ہندوی شما بر من جفای رفت رفت

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود　　بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود

(بہار کے ذکر میں ہے)

یاد باد آنکہ نہانت نظرے با ما بود　　رقمِ مہرِ تو بر چہرۂ ما پیدا بود

پوری غزل میں پہلی دلچسپیوں کو یاد دلایا ہے، اور ہر شعر یاد سے شروع ہوتا ہے،

خوشا شیراز و وضعِ بے مثالش　　خداوندا نگہدار از زوالش

(شیراز کی تعریف میں ہے)

نسیمِ صبحِ سعادت بداں نشاں کہ تو دانی　　خبر بہ کوے فلاں بر بدیں زباں کہ تو دانی

قاصد سے پیغام کہا ہے.

ابن یمین فریومدی

باپ کا نام محمود ہے، قوم کے ترک تھے، اور ترکستان وطن تھا، سلطان محمد خدابندہ کے زمانہ میں خراسان میں آئے اور فریومد میں جو ایک قصبہ کا نام ہے قیام اختیار کیا، یہاں زمین اور جائیدادیں خریدیں، یہ ایلخانی سلطان کا عہدِ حکومت تھا، اور علاء الدین محمد وزیرِ سلطنت تھے، علاء الدین نے ان کی نہایت قدردانی کی، شعر کہتے تھے، یہ رباعی ان کے انداز کلام کا نمونہ ہے،

دارم زعتاب فلک بوقلموں
وز گردشِ روزگار خس پر ور دوں
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک
جانے چو میانۂ پیالہ ہمہ خوں

ابن یمین فریومد میں پیدا ہوئے، باپ نے شاعری کی تعلیم دی، اکثر جن طرحوں پر خود کہتے تھے، بیٹے سے بھی کہلاتے تھے، چنانچہ اوپر کی رباعی پر ان کی رباعی بھی ہے،

دارم زجفای فلک آئینہ گوں
پر آہ دلے کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہ ہزار غم بہ شب روز آرم
تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

ابتدا میں سرداروں کی مداحی کرتے تھے،

بالآخر فقر و قناعت اختیار کی، اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہو گئے، تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی، اس کی کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے تھے، ۸ جمادی الثانی ۷۶۹ھ میں وفات پائی، مرتے وقت یہ رباعی لکھی تھی،

منگر کہ دلِ ابن یمین پُر خوں شد
بنگر کہ ازیں سرای فانی چوں شد

مصحف بہ کف و چشم بہ رہ دل بہ دست | با پیک اجل غمزہ زناں بیروں شد

کلام | اُن کا دیوان سربداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا، غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں کہ میں نے ان کا دیوان دال کی ردیف تک دیکھا ہے لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہوگا، تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ غزل اور قصائد سب کچھ کہتے تھے، ید بیضا میں ان کی غزل کے بعض اشعار نقل کیے ہیں،

سرمایۂ دیدہ ہر دم اشک غماز مرا | تا ساخت فاش پیش مردماں راز مرا
ز خود بیگانہ بودن در رہِ عشق | بہ آں معشوق طرحِ آشنائی است
عشق تا در دل آمد نہ در آمد نہ نمود | بادہ پُر شور نشد تا کہ بہ مستاں نہ رسید

ان اشعار سے اگرچہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں، لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت اور خودداری اُن کا خاص حصہ ہے، ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کوئی ادا نہ کر سکا، اور چونکہ ان کا قال، حال کی تصویر ہے اس لیے ہم ایک خاص اثر رکھتا ہے جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکتا،

دو قرصِ نان، اگر از گندم است یا از جو | دو تای جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوارِ خود بہ خاطرِ جمع | کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزدِ ابنِ یمین | ز فرِّ مملکتِ کیقباد و کیخسرو

اگر دو گاو بدست آوری و مزرعۂ | یکے امیر و یکے را وزیر نام کنی

لہ یہ تمام حالات ید بیضا سے اور تذکرۂ دولت شاہ سے لیے گئے ہیں،

بداں قدر چو کفافِ معاش تو نہ شود — روی و نان جوے از یہود، دام کنی
ہزار بار ازاں بہ کہ از پے خدمت — کمر بہ بندی و بر مردکے سلام کنی

زدیوانہ کرد روزے سوال — سلیمانِ مرسل علیہ السلام
کہ چوں بینی ایں سلطنت کز پدر — مرا ماند با ایں ہمہ احتشام
چنیں گفت دیوانہ او را جواب — کہ چوں نیست ایں مملکت مستدام
پدر بد تنے آہنِ سرد کوفت — تو بر باد پیمودۂ صبح و شام

حضرت داؤدؑ زرہ بنایا کرتے تھے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت مشہور ہے کہ ان کا تخت ہوا پر چلتا تھا، فارسی میں آہن سرد کوفتن اور باد پیمودن کے معنی بیکار کام کرنے کے ہیں، دیوانہ نے حضرت داؤدؑ کے زرہ بنانے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت ہوا پر چلنے کو آہن سرد کوفتن اور باد پیمودن سے تعبیر کیا ہے

مرد آزادہ در میانِ گروہ — گرچہ خوش گوئی و عاقل و داناست
محترم آنگہے تواند بود — کہ از ایشاں بہ مالش استغناست
واں کہ محتاجِ خلق شد خوارست — گرچہ در علم بو علی سیناست

شنیده ام که یکے عقربے ز خانهٔ خویش
برون دوید و همی زو سرا کجا آمد پیش

بہ پیشش آمد سنگے عظیم و بس سنگر
بزد بہ سنگ دو صد نیش تا بگردد ریش

ز سنگ نعره بر آمد که خویش رنجه مدار
که ضرب نیش تو ما را نه کم کند نه بیش

جواب دادش و گفتش که راست می گوئی
ولے پدید کند هر که هست جوهر خویش

شاعری نیست پیشهٔ کہ ازاں
رسدت نان و نیز تره به دوغ

راستی (واقعی) سخت زشت و بے معنی است
اجہ نے خواستن براے دروغ

زاں بود کار شاعراں بے نور
که ندارد چراغ کذب فروغ

قناعت اور توکل کے ساتھ، یہ نکتہ بھی ابن یمین کے ذہن نشین ہے، کہ زر کے بغیر اطمینان نہیں حاصل ہوتا، چنانچہ فرماتے ہیں :-

لاله را گفتم اے پری پیکر
سیرتت خوب و صورتت نیکوست

راست گو ایں سیہ دلی ازچیست
گرت ز چیزے رسید از دوست

گفت زیرا کہ من ندارم زر
زر که اسباب شادکامی ازوست

غنچه را بیں کہ خرده دارد
مے نگنجد ز خرمی در پوست

کبھی کبھی فلسفہ کہہ جاتے ہیں،

زدم از کتم عدم خیمه به صحرائے وجود
از جمادی به نباتی سفرے کردم و رفت

بعد ازانم کشش نفس به حیوانی برد
چون رسیدم بوی ازوی گذرے کردم و رفت

بعد ازاں در صدف سینهٔ انساں به صفا
قطرهٔ هستی خود را گہرے کردم و رفت

با ملائک پس ازاں صومعه قدسی را
گرد برگشتم و نیکو نظرے کردم و رفت

بعد ازاں ره سوی او بردم چوں ابن یمین
همه او گشتم و ترک دگرے کردم و رفت

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ ہند کے تحت ہندوستان کے عہد بعہد کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری و فراخ دلی کی تاریخ کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، ابھی اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے جس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی اور فراخ دلی کی داستان معاصر علمی و تاریخی ماخذوں کے حوالوں سے بیان کی گئی ہے، اس کے بعد کی جلدوں میں یہاں کے دوسرے مسلمان فرمانروا خاندانوں خصوصاً مغل فرمانرواؤں میں بابر سے لیکر عالمگیر اورنگزیب تک کی مذہبی رواداری، انسان دوستی اور آدم نوازی کی داستان بیان کی جائے گی، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن قیمت :- ۲ روپے

تبع تابعینؒ

(حصہ دوم)

یہ سلسلہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں امام ابو حنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ کے علاوہ، اور دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح اور ان کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے، اور حصۂ دوم میں امام وکیع، امام شافعی، امام حمیدی، قاضی شریک، امام نخعی، امام کاظم، امام یحییٰ مصمودی، اور امام عبدالرزاق کے علاوہ اور دوسرے ہم صاحب تصنیف اور صاحب عزیمت تبع تابعین کے حالات اور ان کے علمی خدمات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

(مرتبہ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی علیگ سابق رفیق دارالمصنفین) قیمت :- ۲۰ روپے

مرزا مظہر جان جاناں

(اور ان کا اردو کلام)

مرزا مظہر جان جاناں اردو و فارسی دونوں زبانوں کے ایک صاحب کمال صوفی شاعر ہیں، اس کتاب میں ان ہی کے سوانح و حالات و واقعات زندگی کے ساتھ ان کا تمام اردو کلام پیش کیا گیا ہے، شروع میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے پیش لفظ اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف کے دلچسپ مختصر حالات اور ان کی ادبی خدمات کا ذکر ہے،

(مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی

قیمت :- ۱۲ روپے

Mellalite skin cream